ڈاکٹر اسرار احمد

کی تازہ تالیف

سابقہ اور موجودہ
مُسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل
اور
مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری

فہرست مضامین

- ہیں آج کیوں ذلیل؟
- قرآن کا قانون عذاب
- سابقہ اور موجودہ مسلمان امتیں اور سابقہ امت یعنی یہود کی دو ہزار سالہ تاریخ
- موجودہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ
- بیسویں صدی عیسوی
- ابراہیمی مذاہب کا ثالث ثلاثہ
- آنے والے دور کی واضح تصو
- اسلام کا عالمی غلبہ
- پندرہویں صدی ہجری
- خلیج کی جنگ: "جنگوں کی ماں"؟
- پاکستان کا مستقبل
- ہماری نجات کا واحد ذریعہ
- احادیث کی تخریج

☆ صفحات ۱۷۶ —— ☆ سفید کاغذ —— ☆ دیدہ زیب

قیمت:۔/۳۶

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن: ۳۶۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون:

لائبریری
ماڈل ٹاؤن لاہور

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

(البقرۃ: ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر

پروفیسر حافظ احمد یار، حافظ خالد محمود خضر

جلد ۱۳ | رجب المرجب ۱۴۱۴ھ، جنوری ۱۹۹۴ء | شمارہ ۱

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴- فون: ۸۵۶۰۰۳

کراچی آفس: ۱۱-داؤد منزل متصل شاہ بحری، شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرِ تعاون ۶۰/- روپے، فی شمارہ ۶/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس، ہسپتال روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اول

"حکمت قرآن" کے ادارتی صفحات میں ہم مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مختلف تعلیمی اسکیموں اور ان کے ضمن میں ہونے والی پیش رفت سے وقتاً فوقتاً قارئین کو آگاہ کرتے رہتے ہیں۔ اس ضمن میں اطلاعی نوعیت کی دو باتوں کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

۱) پچھلے دنوں قرآن کالج کے سال دوم کے ایک طالب علم محبوب الحق عاجز نے کل پاکستان مضمون نویسی کے ایک مقابلے میں اول انعام حاصل کیا ہے۔ مضمون نویسی کا یہ مقابلہ ادارہ منہاج القرآن کے زیر اہتمام منعقد ہوا اور اس میں پاکستان بھر سے ایک بڑی تعداد میں کالج کے طلبہ نے حصہ لیا۔ عنوان تھا "نبی اکرم ﷺ بحیثیت پیغمبرِ انقلاب"۔ نتیجے کی جو نقل ہمیں موصول ہوئی ہے اس کے مطابق منصفین کے متفقہ فیصلے کے مطابق محبوب الحق عاجز اول قرار پائے، جبکہ گورنمنٹ کالج آف سائنس ایجوکیشن لاہور کے ظفر اقبال محسن دوسری پوزیشن کے اور جامعہ اسلامیہ منہاج القرآن کے شبیر احمد تیسری پوزیشن کے حقدار قرار دیئے گئے۔ یہ مقابلہ چونکہ کُل پاکستان بنیاد پر تھا اور اس میں پاکستان بھر سے طلبہ شریک بھی ہوئے لہٰذا قرآن کالج کے ایک طالب علم کا اول انعام حاصل کرنا نہ صرف یہ کہ بحمد اللہ کالج کے وقار میں اضافے کا باعث بنا ہے بلکہ اس ذریعے سے قرآن کالج بھی ایک وسیع تر حلقے میں متعارف ہوا ہے جو بہت سے اعتبارات سے خوش آئند ہے۔

۲) عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا وسیع پیمانے پر اہتمام مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے اہداف و مقاصد کی فہرست میں ہمیشہ نمایاں مقام کا حامل رہا ہے کہ قرآن حکیم سے براہ راست کسبِ ہدایت کرنے کے لئے عربی زبان کی اتنی تحصیل ناگزیر ہے کہ پڑھنے والا بغیر کسی ترجمے کی مدد کے قرآن کا مفہوم اخذ کرتا چلا جائے جس کے لئے قرآنی اصطلاح "تذکّر بالقرآن" کی ہے۔ چنانچہ مرکزی انجمن کی تشکیل کے بعد جو فوری عملی اقدامات کئے گئے ان میں انجمن کے سابق دفتر ۱۲/ افغانی روڈ، سمن آباد میں کلّیۃ القرآن کے نام سے عربی کلاسوں کا اجراء بھی شامل تھا۔ آج کل بھی قرآن اکیڈمی کے ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں سب سے زیادہ زور عربی سیکھنے پر دیا جاتا ہے اور قرآن کالج کے طلبہ کو بھی عربی زبان ایک لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں گاہے بگاہے شام کے اوقات میں بھی ان لوگوں کے لئے کہ جو ایک سالہ کورس کے لئے وقت فارغ نہ کر سکتے ہوں، عربی کلاس کا اجراء کیا جاتا رہا ہے۔ تاہم شام کی کلاس کا تجربہ کچھ زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں

(باقی صفحہ ۷ پر)

ڈاکٹر اسرار احمد

سورۂ ہود

(آیات ۷۷—۸۰)

نَحْمَدُہٗ وَ نُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم ۔ اما بعد

فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم ○

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوْطًا سِیْٓءَ بِہِمْ وَضَاقَ بِہِمْ ذَرْعًا وَّ
قَالَ ھٰذَا یَوْمٌ عَصِیْبٌ ○ وَجَآءَہٗ قَوْمُہٗ یُھْرَعُوْنَ اِلَیْہِ ط
وَمِنْ قَبْلُ کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ ط قَالَ یٰقَوْمِ ھٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِیْ
ھُنَّ اَطْھَرُ لَکُمْ فَاتَّقُوا اللّٰہَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِیْ ضَیْفِیْ ط اَلَیْسَ مِنْکُمْ
رَجُلٌ رَّشِیْدٌ ○ قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِیْ بَنٰتِکَ مِنْ حَقٍّ ج وَ
اِنَّکَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِیْدُ ○ قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ○

"اور جب ہمارے پیغامبر لوطؑ کے پاس پہنچے تو وہ ان کے بارے میں بہت غمگین اور مضطرب ہوا اور اس نے کہا کہ آج کا دن تو بہت ہی کٹھن ہے۔ اور آئے اس کے پاس اس کی قوم کے لوگ بگٹٹ دوڑتے ہوئے، اور بدکاری کے تو وہ پہلے سے خوگر تھے ہی، اس نے کہا: "اے میری قوم کے لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں، وہ تمہارے لیے کہیں زیادہ پاکیزہ ہیں، پس اللہ کا خوف کھاؤ اور مجھے میرے مہمانوں کے معاملے میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی ایک بھی شریف آدمی نہیں رہا ہے؟" انہوں نے جواب دیا: "تجھے خوب معلوم ہے کہ تیری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں اور تجھے یہ بھی خوب معلوم ہے کہ ہم کس چیز کے طالب ہیں!" لوطؑ نے کہا: "کاش خود میرے پاس تمہارے مقابلے کے لیے قوت ہوتی یا میں کسی مضبوط سہارے کی پناہ ہی حاصل کر سکتا!"

قرآن حکیم میں مکی سورتوں کا طویل ترین سلسلہ وہ ہے جو سورۂ یونس سے سورۂ مومنون تک پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے کی پہلی دو سورتوں یعنی سورۂ یونس اور سورۂ ہود میں ایک حسین جوڑے کی نسبت بتمام و کمال موجود ہے۔ چنانچہ "انباء الرسل" یعنی اولوالعزم رسولوں کے حالات کے ضمن میں بھی ان دونوں سورتوں میں عکسی نسبت پائی جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں اس ضمن میں جن چھ رسولوں کے حالات اور ان کی قوموں کے انجام کا ذکر بتکرار و اعادہ آیا ہے ان میں سے اوّلین یعنی حضرت نوحؑ کا ذکر سورۂ یونس میں تقریباً نصف رکوع میں ہے، لیکن سورۂ ہود میں پورے دو رکوعوں میں' اور آخری یعنی حضرت موسیٰؑ کا ذکر سورۂ یونس میں تقریباً ڈیڑھ رکوعوں پر پھیلا ہوا ہے تو سورۂ ہود میں درجۂ اجمال سے ہے۔ اسی طرح درمیانی چار رسولوں یعنی حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیبؑ کا ذکر سورۂ یونس میں بغیر نام لیے نہایت اجمال سے صرف ایک آیت میں ہو گیا ہے جبکہ سورۂ ہود میں ان سب کے لیے ایک ایک رکوع مخصوص ہے۔

جن آیات کا ترجمہ ابھی آپ نے سماعت فرمایا ہے وہ سورۂ ہود کے ساتویں رکوع میں شامل ہیں۔ اس رکوع میں قرآن مجید کی بعض دوسری سورتوں کی طرح حضرت لوطؑ جس قوم کی جانب مبعوث ہوئے تھے اس کے انجام بد کے ذکر کی تمہید کے طور پر حضرت ابراہیمؑ کا ذکر بھی آیا ہے۔ یعنی وہ فرشتے جو اس قوم کی ہلاکت کے حکمِ الٰہی کی تنفیذ کے لیے بھیجے گئے تھے ان کی طرف جانے سے قبل حضرتِ ابراہیمؑ کے پاس حضرت اسحٰقؑ کی ولادت کی خوشخبری پہنچانے آئے تھے اور اسی موقع پر انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کو مطلع کر دیا تھا کہ جن بستیوں کی جانب حضرت لوطؑ مبعوث ہوئے ہیں اب ان کی آخری ہلاکت کا وقت آ پہنچا ہے جس پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنی نرم دلی کے باعث ان سے کچھ مجادلہ بھی کیا جس کا آخری جواب انہیں یہ ملا کہ "یٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ اَعۡرِضۡ عَنۡ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدۡ جَآءَ اَمۡرُ رَبِّكَ ۚ وَاِنَّهُمۡ اٰتِيۡهِمۡ عَذَابٌ غَيۡرُ مَرۡدُوۡدٍ ۝ "یعنی اے ابراہیمؑ اب اس معاملے سے قطع نظر کر لو، اس لیے کہ تمہارے رب کا حکم صادر ہو چکا ہے اور اب ان لوگوں پر وہ عذاب آ کر ہی رہے گا جو کسی کے لوٹائے لوٹ نہیں سکتا!"

اس کے بعد وہی فرشتے حضرت لوطؑ کے پاس پہنچے۔ اور خود قرآنِ مجید کے فحوائے کلام سے بھی متبادر ہوتا ہے اور تفسیری روایات سے بھی تائید ہوتی ہے کہ وہ خوبصورت لڑکوں کی صورت میں تھے جن کو دیکھتے ہی وہ امرد پرست لوگ شہوتِ نفسانی سے مغلوب ہو کر بگٹٹ دوڑتے

ہوتے حضرت لوطؑ کے گھر آدھمکے۔ واضح رہے کہ قرآن نے اگرچہ مجازاً ان لوگوں کو "قومِ لوط" کہا ہے لیکن حضرت لوطؑ ہرگز ان میں سے نہ تھے۔ آنجنابؑ تو حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے جو ان کے ساتھ ہی ہجرت کر کے عراق سے بلادِ شام پہنچے تھے اور پھر حضرت ابراہیمؑ کے حسبِ ہدایت بحرِ مردار کے ساحل پر واقع سدوم اور عمورہ کی بستیوں میں دعوت الی اللہ اور عقائد و اخلاق کی اصلاح کی سعی فرما رہے تھے۔ اس علاقے کے لوگ شرک کے ساتھ ساتھ بدترین اخلاقی پستی سے دوچار ہو چکے تھے اور ان میں مردوں کا مردوں ہی سے جنسی لذت حاصل کرنے کا حد درجہ غیر فطری اور قبیح عمل نہ صرف یہ کہ عام ہو چکا تھا بلکہ اس میں ان کی ڈھٹائی اور بے حیائی اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ وہ یہ خبیث حرکت برسرِ عام لوگوں کی نگاہوں کے عین سامنے کرتے تھے۔ اور حضرت لوطؑ ان کی اصلاح کی ہر ممکن سعی کے باوجود اپنے مشن میں بالکل ناکام ہو چکے تھے۔ چنانچہ اللہ کے آخری فیصلے کا وقت آ پہنچا اور اس کے ضمن میں اللہ نے اپنی حکمتِ بالغہ کے تحت ایسی صورت اختیار کی کہ از خود ہی ظاہر ہو جائے کہ یہ قوم اخلاقی دیوالیے پن کی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور پوری طرح مستحق ہو چکی ہے کہ اسے ہلاک اور نیست و نابود کر دیا جائے

حضرت لوطؑ کا ماتھا تو اپنے خوبصورت اور نوعمر مہمانوں کو دیکھتے ہی ٹھنک گیا تھا کہ آج بہت کٹھن مرحلے سے گزرنا ہوگا۔ جب انہوں نے لوگوں کے تیور دیکھے تو آخری اتمامِ حجت کے طور پر دو باتیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ یہ میرے مہمان ہیں اور مہمانوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کا ذمہ دار میزبان ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تمہارے اندر شرافت اور مروّت کی کوئی ادنیٰ رمق بھی باقی رہ گئی ہے تو مجھے اس معاملے میں ذلیل و رسوا نہ کرو۔ یہ قدیم زمانے اور بالخصوص اقوامِ عرب کے اعتبار سے بہت زیادہ مؤثر اپیل ہو سکتی تھی جسے نظر انداز کر کے گویا انہوں نے اپنی شرافت اور مروت کے دیوالہ نکل جانے کا ثبوت فراہم کر دیا۔ دوسرے یہ کہ اگر تم اپنے جذبۂ شہوت کی تسکین چاہتے ہو تو میری بیٹیاں موجود ہیں' ان سے تم اپنے جذبے کی تسکین فطرت کے عین مطابق اور فی نفسہٖ پاکیزہ طریقے پر کر سکتے ہو۔ یہاں "بیٹیوں" کے مفہوم و معنیٰ کے بارے میں سلف ہی سے دو رائیں موجود ہیں اور دونوں ہی کا احتمال یکساں و برابر ہے' یعنی ایک یہ کہ حضرت لوطؑ نے خود ان کی بیویوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیا ہو۔ اس لیے کہ ہر عمر رسیدہ شخص بالخصوص وہ جو نیک اور پارسا بھی ہو اور دوسروں کو بھی نیکی اور پارسائی کی تلقین کرتا ہو قوم کی تمام عورتوں کے لیے بمنزلہ باپ ہوتا

ہے۔ اور دوسرے یہ کہ حضرت لوطؑ نے قوم کے سرداروں کو پیش کش کی ہو کہ میں اپنی بیٹیوں کا نکاح تم سے کیے دیتا ہوں۔ اور یہ بھی بغرض اتمام حجت و قطع عذر!! ——— لیکن اس کا جو جواب لوگوں نے دیا اس میں جہاں یہ ڈھٹائی نقطۂ عروج کو پہنچی نظر آتی ہے کہ "اے لوط! خواہ مخواہ اِدھر اُدھر کی باتوں میں ہمارا وقت ضائع نہ کرو۔ تمہیں خوب معلوم ہے کہ ہم کس ارادے سے آئے ہیں اور ہمیں فی الواقع کیا مطلوب ہے!" ——— وہاں ان کا یہ منافقانہ کردار بھی انتہا کو پہنچا نظر آتا ہے کہ حیوانیت کی اس اسفل ترین سطح تک پہنچے ہوتے ہونے کے باوجود "حق" کا لفظ بھی ان کی زبان پر آتا ہے اور وہ بڑے حق پرستانہ انداز میں کہتے ہیں (اگرچہ فی الواقع اس میں گہرا طنز پنہاں ہے) کہ "اے لوط! تم خوب جانتے ہو کہ تمہاری بیٹیوں پر ہمارا کوئی حق نہیں ہے!" — چشم تصور سے بخوبی دیکھا جا سکتا ہے کہ ان الفاظ کو ادا کرتے ہوئے ان میں سے بعض کے لبوں پر تبسم یا زہر خند بھی ہو گا۔

اس صورت حال پر جو کیفیت حضرت لوط علیہ السلام کی ہوئی وہ ان کے ان الفاظ سے بخوبی ظاہر ہے: "لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ" یعنی "کاش کہ میرے پاس اتنی طاقت ہوتی کہ تمہارا مقابلہ کر سکتا، یا کوئی مضبوط سہارا ایسا ہوتا جس کی پناہ حاصل کر لیتا!" واضح رہے کہ حضرت لوطؑ کے نہ تو اولاد نرینہ تھی کہ بیٹوں کے ہاتھ اُن کی مدافعت میں اٹھ سکتے نہ ہی ان کا کوئی کنبہ قبیلہ ہی ایسا تھا جو اس آڑے وقت میں ان کا سہارا بن سکتا۔ (جیسا کہ آگے حضرت شعیبؑ کے ذکر میں آ رہا ہے کہ ان کے مخالفین نے کہا تھا کہ "لَوْلَا رَھْطُکَ لَرَجَمْنٰکَ" یعنی اے شعیب اگر ہمیں تمہارے قبیلے والوں کا ڈر نہ ہوتا تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے یا جیسے کہ خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو سنہ نبوی تک یعنی ہجرت سے تین سال قبل تک ابوطالب کی وساطت سے اپنے خاندان یعنی بنی ہاشم کی حمایت حاصل رہی ——— حضرت لوطؑ کا معاملہ یہ نہ تھا۔ وہ اس بستی میں اجنبی تھے اور جیسا کہ ترمذی کی حدیث میں صراحتہً مذکور ہے ان کا کوئی کنبہ قبیلہ وہاں موجود نہ تھا)

گویا ظاہری اور مادی اعتبار سے وہ اس وقت بالکل بے سہارا اور بے یار و مددگار تھے۔ چنانچہ انتہائی کس مپرسی اور بے چارگی کے عالم میں یہ الفاظ ان کی زبان پر آ گئے۔ حالانکہ فی الحقیقت تو تمام ظاہری سہاروں سے بڑھ کر مضبوط سہارا ہر بندۂ مومن کو ہر جگہ اور ہر وقت حاصل ہوتا ہے، یعنی اللہ کی مدد اور اس کا سہارا۔ چنانچہ یہی ہے وہ بات جو آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حد درجہ صبر

الفاظ میں ادا فرمائی ـــــ یعنی: "رَحِمَ اللهُ لوطًا فَاِنَّهٗ کَانَ یَاْوِیْ اِلٰی رُکْنٍ شَدِیْدٍ ـــــ" اللہ لوط پر رحم فرمائے مضبوط ترین سہارا تو انہیں حاصل ہی تھا!" اس سے معلوم ہوا کہ بربنائے طبع بشری اسبابِ ظاہر سے کسی وقت کسی درجے میں فوری اور عارضی طور پر متأثر ہو جانا شانِ نبوت و رسالت سے بعید نہیں ہے جیسے کہ حضرت موسیٰؑ کوہِ طور پر عصا کے اژدہا بن جانے سے وقتی طور پر خوفزدہ ہو گئے تھے اور جادوگروں سے مقابلے میں ان کی رسیوں اور چھڑیوں کے سانپ کا روپ دھار لینے سے فوری طور پر متأثر ہو گئے تھے۔ بالکل یہی معاملہ اس موقع پر حضرتِ لوطؑ کے ساتھ پیش آیا۔ حالات اتنے ناساعد اور صورتِ حال اتنی شدید تھی، گویا ع "مرحلہ سخت ہے اور آن، عزیز!!" والی کیفیت سے اس شدت سے سابقہ پیش آیا تھا کہ شدتِ تأثر میں یہ الفاظ آنجنابؑ کی زبان پر آ گئے ـــــ اور اغلباً یہ بھی مشیتِ خداوندی کے تحت ہوا تا کہ ایک صالح و مصلح اور ناصح مشفق شخص کو اس درجہ زِچ کر دینے والی قوم کے بارے میں یہ بات از خود ثابت ہو جائے کہ وہ اب کسی رعایت کی مستحق نہیں رہی اور عذابِ استیصال کی پوری حق دار بن چکی ہے بقول شاعر ؎

تا دلِ صاحب دلے نامد بہ درد ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس انجام بد سے بچائے، اور خیر و صلاح کی جانب رغبت اور مصلحین و ناصحین کی باتوں کو توجہ سے سننے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

بقیہ: حرفِ اوّل

ہوتا رہا۔ ابتداء میں جو ذوق و شوق اور جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے وہ بعد میں برقرار نہیں رہتا اور دو ایک ہفتے بعد ہی کلاس کے شرکاء کی تعداد آدھی رہ جاتی ہے اور سارا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس بار اللہ کے فضل و کرم سے کچھ مختلف صورت سامنے آئی ہے۔ قریباً دو ماہ قبل قرآن کالج میں شام کے اوقات میں شروع کی جانے والی کلاس ہر اعتبار سے بہت کامیاب نظر آتی ہے۔ شرکاء کی تعداد اور ان کے ذوق و شوق دونوں میں کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی۔ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ اس میں پڑھنے والوں کے شوق طلب کے ساتھ ساتھ پڑھانے والے کی محنت کو بھی دخل ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ اللہ کی تائید و توفیق کا مظہر ہے کہ اس کلاس کا معاملہ تاحال تسلی بخش ہی نہیں حوصلہ افزا بھی ہے۔ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ OO

قرآن مجید کی اثر انگیزی

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو عربوں کی زبان میں نازل کیا تھا اور عربوں کو اپنی قدرتِ کلام، فصاحت و بلاغت، زور بیان، زبان دانی اور طلاقتِ لسانی پر بڑا ناز تھا۔ وہ اپنے علاوہ ساری دنیا کو عجم یعنی گونگا کہتے تھے۔ لیکن انہی عربوں کے پاس جن کو اپنی خطابت اور لسانی کا بڑا زعم اور گھمنڈ تھا، جب قرآن کی آیتیں اتریں تو وہ دم بخود اور حیرت زدہ ہو گئے اور اس کے زور بیان اور طرز کلام کو دیکھ کر اپنے آپ کو عاجز اور درماندہ تصور کرنے لگے اور اس کی بلاغت و فصاحت کے سامنے اپنی فصاحت و بلاغت کو حقیر و بے معنی سمجھنے لگے۔ اور جب انہی عربوں کو جو اپنے آپ کو سب سے بڑا زبان دان اور ساری دنیا کو گونگا کہتے تھے، قرآن مجید نے چیلنج کیا کہ اس کے جیسی کوئی ایک سورۃ یا دس آیتیں یا ایک ہی آیت پیش کر دو تو تمہاری لسانی کے کرتب اور زورِ بیان کا کمال تسلیم کر لیا جائے گا، تو وہ اس تحدّی کا جواب نہ دے سکے اور کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب اور اعلیٰ درجہ کے ادیب و انشاء پرداز کو بھی یہ جرأت نہ ہوئی کہ قرآن حکیم جیسا کوئی کلام پیش کرے۔ قرآن کے زور بیان اور طرز کلام سے سب مبہوت اور سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ لبید بن ربیعہ عرب کے بڑے نامور اور ممتاز شاعر تھے۔ یہ اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔ زمانۂ جاہلیت میں جن سات شعراء کے قصائد خانہ کعبہ میں آویزاں تھے، ان میں ان کا بھی ایک قصیدہ تھا۔ ان کی بلند پائیگی اور شاعرانہ کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اموی دور کے مشہور اور عظیم شاعر فرزدق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ان کے ایک شعر۔

و جلا السیول عن الطلول کانّها

زبر تجد متونها اقلامها

(یعنی سیلاب نے ٹیلوں کو لکھے جانے والے کاغذ کی طرح صاف شفاف بنا دیا ہے۔)

کو سن کر سجدہ ریز ہو گیا تھا(۱)۔ لیکن ایسا باکمال اور بلند پایہ شاعر بھی قرآن کا زور و اثر دیکھ کر اس درجہ مبہوت اور مسحور ہوا کہ اس کے بعد اس نے شاعری بھی ترک کر دی۔ امیر المومنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک دفعہ ان سے شعر پڑھنے کے لئے کہا تو انہوں نے جواب دیا :جب خدا نے ہمیں بقرہ اور آل عمران سکھادی ہیں تو پھر شعر کہنا ہم کو زیب نہیں دیتا۔(۲)

لبید بن ربیعہ نے زمانہ جاہلیت میں قسم کھائی تھی کہ اگر پروا ہوا چلے گی تو وہ اونٹ ذبح کر کے احباب کی دعوت کریں گے۔ اسلام لانے کے بعد یہ صورت پیش آئی مگر اُس وقت ان کے پاس نہ تو اونٹ تھے اور نہ ان کو خریدنے کے لئے رقم۔ ولید بن عقبہ کو' جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جانب سے کوفہ کے گورنر تھے' معلوم ہوا تو ان کے یہاں دس اونٹ بھجوائے اور چند شعر کہنے کی فرمائش کی۔ حضرت لبید نے اونٹوں کو تو ذبح کر دیا لیکن چونکہ شعر گوئی ترک کر چکے تھے اس لئے اپنی لڑکی سے شعر کہنے اور شکریہ ادا کرنے کے لئے کہا۔ اس نے جواب لکھ کر ان کو دکھلایا تو انہوں نے پسند کیا مگر آخری شعر۔

فعُد انّ الکریم لہٗ معاد

و ظنی یا ابن اروٰی ان تعودا

(ترجمہ: "آپ دوبارہ بھی اسی طرح سخاوت کیجئے اور ہم کو ہدیہ بھیجئے' کیونکہ شریف آدمی بار بار ہدیے کرتا ہے اور اے ابن اروٰی میرا خیال ہے کہ آپ دوبارہ اپنی فیاضیوں سے ہم کو محروم نہ رکھیں گے"۔)

میں چونکہ مزید طلب اور بخشش کی تمنا ظاہر کی گئی تھی اس لئے انہوں نے کہا :مزید طلب کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لڑکی نے جواب دیا :امیر و حاکم سے مزید طلب کرنے میں کوئی حرج نہیں' وہ عام لوگوں میں ہوتا تو میں مزید کی درخواست نہ کرتی۔(۳)

۱۔ طبقات الشعراء لابن قتیبہ ص ۱۴۸

۲۔ الاستیعاب لابن عبد البر' ص ۲۳۵

۳۔ طبقات الشعراء ص ۱۴۹

مولانا شبلی نے خواجہ حافظ کے کمالات اور ان کی شاعری کی عظمت واثر انگیزی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"خواجہ حافظ کے بعد اصولِ ارتقاء کے خلاف غزلیہ شاعری کی ترقی ڈیڑھ سو برس تک رک گئی' جس طرح قرآن مجید کے نازل ہونے کے بعد شعراء کی زبانیں بند ہو گئیں"۔(۴)

یہ قرآن کی عظمت وبلند پائیگی اور اس کا غیر معمولی اعجاز واثر ہی تھا کہ سخت سے سخت دل بھی نرم ہو گئے اور وادیٔ ظلمات میں بھٹکنے والوں کو سراج منیر مل گیا اور نہایت قلیل عرصہ میں اسلام کا مہر درخشاں عرب کے افق سے آگے بڑھ کر دوسرے خطوں اور ملکوں کے مطالع پر ضوفشانی کرنے لگا اور چشم زدن میں لوگ فوج در فوج حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کی شوکت وقوت سے مرعوب ہو کر لوگوں نے اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا' نبی اکرم ﷺ کے اخلاق فاضلہ اور اعلیٰ سیرت وکردار نے متنفر اور بیزار طبیعتوں کو متوجہ ومائل کر لیا' قرآن مجید نے غیب کے متعلق جو خبریں دیں اور پیشینگوئیاں کیں جب وہ صحیح ثابت ہونے لگیں تو اس کے باعث لوگ اسلام کی صداقت قبول کرنے پر مجبور ہو گئے۔ علیٰ ہذا القیاس اسلام کی ہمہ گیر اور جامع دعوت' اعلیٰ تعلیم اور ابدی اصول وقوانین نے لوگوں کو اس کا گرویدہ بنا دیا۔ یہ سب صحیح ہے' لیکن غور کیجئے' ابتداءً نہ تو اسلام کی ہمہ گیری اور جامعیت کا لوگوں کو تجربہ ہوا تھا اور نہ اخبارِ غیب کے درست اور سچ ثابت ہونے کا' اور اُس وقت اسلام کی قوت وشوکت سے مرعوب ہونے کا بھی سوال نہ تھا' البتہ رسالت مآب ﷺ کی پاکیزہ سیرت وکردار' دیانت وامانت اور صدق وعفاف وغیرہ کا ضرور تجربہ تھا' لیکن یاد ہو گا کہ کوہِ صفا پر جب آپ ﷺ نے اپنے اخلاقِ فاضلہ کا حوالہ دے کر لوگوں کو حق وتوحید کی دعوت دی تو وہ کتنے لوگوں کو اپیل کر سکی۔ بعضوں نے تو اس وقت یہاں تک کہہ دیا تھا: تَبًّا لَکَ اَلِھٰذَا دعوتنا (تمہارا ستیاناس ہو' کیا اسی

۴۔ شعر العجم جلد پنجم ص ۵۸

لئے ہم کو بلایا تھا)۔

پس یہ قرآن کی بلاغت و تاثیر تھی جس نے صدیوں کے پرانے باطل اور لغو خیالات وعقائد کو تھوڑی مدت میں تبدیل کردیا' تاریک اور مردہ دلوں کو روشن اور شاداب بنادیا' وادیٔ ظلمات میں بھٹکنے والوں کو راہِ ہدایت وسعادت پر گامزن کردیا۔ خود مشرکین عرب بھی جو اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسلام کی صداقت آشکارا ہونے کے باوجود بھی اپنے باپ دادا کے دین سے چمٹے رہے' قرآن کے اثر و نفوذ کے پوری طرح معترف تھے اور اس کی غیر معمولی تاثیر ہی کی وجہ سے اس کو سحر' شعبدہ اور شعر' اور آنحضور ﷺ کو ساحر' کاہن اور شاعر کہتے تھے۔ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر ان کے ان اقوال و آراء کو نقل کرکے ان کی تردید کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ ان چیزوں کی اثر آفرینی بالکل مکمل ہے۔ دوسرے سحر و شعر وغیرہ کہہ کر وہ کلامِ الٰہی کو لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت بنانا چاہتے تھے تاکہ لوگ اس کی طرف کوئی دھیان اور توجہ نہ دیں' کیونکہ انہیں قرآن کے اعجاز و اثر پر پورا یقین تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جس نے ایمانداری اور غیر جانبداری کے ساتھ اس کو سنا وہ اس کی دعوت کو قبول کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی لئے وہ اپنے حدِ امکان بھر عام لوگوں کو قرآن سننے سے باز رکھنے کی پوری کوشش کرتے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ : ۲۶)

"اور کافروں نے کہا تم لوگ اس قرآن کو نہ سنو اور جب یہ پڑھا جائے تو بک بک کرو تاکہ تم غالب آسکو۔"

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنی چاہئے کہ مشرکینِ عرب قرآن حکیم کو سحر و شعبدہ صرف اس کو بے وزن اور کمتر ثابت کرنے کے لئے کہتے تھے اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ اس کو واقعتاً کہانت' سحر اور شعر ہی سمجھتے تھے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُس وقت' جیسا کہ جاحظ وغیرہ نے تصریح کی ہے' بے شمار بڑے بڑے خطیب و شاعر بھی تھے اور کاہن و ساحر بھی' لیکن کیوں کسی کو یہ مجال اور جرأت نہ ہوئی کہ قرآن کا چیلنج قبول کرتا اور اس کے جیسی ایک آیت ہی پیش کرکے دکھادیتا۔

معلوم ہوا کہ قرآن کے اثرات بڑے دور رس اور نتیجہ خیز ہوتے تھے اور عام ذہنوں اور سادہ طبیعتوں کے سامنے جب اس کی آواز گونجتی تھی تو وہ ان میں جگہ پیدا کئے بغیر نہیں رہتی تھی۔ ذیل میں ہم تاریخ و سیر اور حدیث کی کتابوں سے کچھ ایسے واقعات نقل کرتے ہیں جن سے قرآن کے کمالِ تاثیر کا پورا اندازہ ہو جائے گا۔ باقی اسبابِ تاثیر' وجوہِ اعجاز اور اسرارِ بلاغت سے تعرض کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ قدیم علماء او موجودہ زمانہ کے بعض مصنفین نے اس پر مستقل کتابیں لکھی ہیں اور اگر ضرورت ہوئی تو انشاءاللہ آئندہ اس پر بھی لکھا جائے گا۔

آنحضرت ﷺ نے جب دعوتِ حق بلند کی اور اسلام کی باقاعدہ تبلیغ شروع کی تو کفار قریش نے آپؐ اور آپؐ کے رفقاء کے ساتھ جو ظالمانہ اور وحشیانہ سلوک کیا اس کو دیکھ کر جنگل کے وحوش و بہائم بھی شرما گئے ہوں گے۔ دوستوں اور خیر خواہوں نے بھی سمجھایا کہ خواہ مخواہ اپنی جان جوکھم میں ڈالنے اور خطرات مول لینے سے کیا فائدہ؟ لیکن آپؐ پر حقیقت منکشف ہو چکی تھی اور قرآن کی بتائی ہوئی راہ ہدایت سے دستکش ہو جانا کسی حال میں بھی گوارا نہ تھا۔ کیا یہ قرآن کی اثر انگیزیوں کا کرشمہ نہ تھا کہ ہزاروں مخالفتوں اور شدید ترین مصائب و محن سے گھبرا کر ایک لحظہ کے لئے بھی راہ حق سے منہ موڑ لینے کا دل میں خیال نہ گزرا۔ غور کیجئے جب ابو طالب جیسا شفیق و غمگسار چچا بھی جوش محبت میں سرشار ہو کر نہایت الحاح کے ساتھ دین حق کی دعوت و تبلیغ سے منع کرتا ہے تو آپؐ ان کو اس کا کیا جواب دیتے ہیں۔ یہی نا کہ "عم محترم! اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ میں چاند اور دوسرے میں سورج بھی رکھ دیں تو میں اپنی دعوت و تبلیغ اور فریضہ حق کی ادائیگی سے دستبردار نہ ہوں گا۔"

قریش حیران تھے کہ آخر آپ اس قدر سختیاں کیوں جھیل رہے ہیں۔ کیا ہیں وہ وجوہ اور اسباب اور ایسی کیا کشش ہے جس کے لئے ساری اذیتیں اور تکلیفیں گوارا ہیں' لیکن دعوتِ قرآنی سے انحراف گوارا نہیں۔ ظاہر ہے عام انسانی ذہن و طبیعت ایسی سخت جانفشانی و جانبازی اور اتنی غیر معمولی ریاضت و نفس کشی کا سبب و مقصد جاہ و دولت کی طلب' عزت و ریاضت کی آرزو' نام و نمود کی خواہش اور شہوت و ہوس رانی کی تکمیل کے

علاوہ اور کن چیزوں کو قرار دے سکتی ہے۔ چنانچہ مشرکینِ مکہ اور کفارِ قریش نے بھی یہی سمجھا اور عتبہ بن ربیعہ ان کی نمائندگی کرتے ہوئے دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کرتا ہے: "محمد (ﷺ) کیا چاہتے ہو؟ مکہ کی سیاست' قریش کی سیادت' کسی بڑے گھرانے کی حسین و جمیل عورت سے شادی' یا مال و دولت کا ذخیرہ تم کو مطلوب ہے؟ ہم لوگ یہ سب کچھ تمہارے لئے مہیا کر سکتے ہیں۔ تم کو اپنا سردار بنانے کے لئے بھی تیار ہیں اور ہم کو یہ بھی منظور ہے کہ سارا مکہ تمہارے زیرِ فرمان ہو جائے۔ لیکن خدا کے لئے اپنی ان باتوں کو ترک کر دو"۔ عتبہ کو یقین تھا کہ اس کی درخواست مسترد نہ ہو گی اور قریش میں اس کی مقبولیت و اعزاز کا ایک بڑا میدان ہاتھ آگیا ہے۔ مگر اس کو کیا معلوم سرورِ کائنات ﷺ کی عظمت و شان اس سے کتنی بالا ہے؟ اور اس نے مقامِ رسالت و منصبِ نبوت کی کتنی شدید گستاخی کی ہے۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

عتبہ کی ترغیبات کے جواب میں آپ ﷺ نے قرآن مجید کی یہ آیتیں تلاوت کیں:

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ○ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ○ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ○ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○ (حٰمٓ السجدہ: ۵ تا ۹)

"تم کہہ دو کہ میں تمہاری ہی طرح کا ایک آدمی ہوں (البتہ) میری جانب اس بات کی وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا ایک ہے اس لئے سیدھے اسی کی طرف رخ کرو اور اس سے مغفرت چاہو' اور خرابی ہے مشرکوں کے لئے جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں۔ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کئے ان کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا بدلہ ہو گا۔ تم کہو کہ کیا تم لوگ

اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا اور تم اس کے شرکاء ٹھہراتے ہو؟ وہ تو تمام عالم کا پروردگار ہے"۔

عتبہ پر ان آیتوں کا یہ اثر ہوا کہ قریش کو جا کر سمجھانے لگا کہ محمد (ﷺ) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ شاعری نہیں کوئی اور چیز ہے' میری رائے یہ ہے کہ تم ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو' اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو یہ تمہاری عزت ہی کا سامان ہو گا' ورنہ عرب خود اس کو تباہ کر دے گا۔(۵)

یہ تو رسول اکرم ﷺ کی عملی زندگی سے قرآن کی اثر انگیزی کا ثبوت ہے کہ ہزاروں مخالفتوں کے باوجود یہ اس کی عجیب تاثیر اور حیرت انگیز کشش تھی کہ آپؐ اس کی تبلیغ و تلقین ترک کرنے پر کسی طرح آمادہ نہ ہوئے۔ لیکن دوسری جانب قرآن سننے اور اس کے پڑھے جانے سے بھی آپ شدید طور پر متاثر ہوتے تھے۔ صحابہ کرامؓ سے قرآن سنانے کی خواہش کرتے اور جب کوئی سناتا تو لطف' لذت اور محویت کی عجیب کیفیت آپؐ پر طاری ہو جاتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ (اور بعض روایتوں کے مطابق عمرو بن مرّہ ؓ) سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھ کو قرآن سناؤ۔ انہوں نے عرض کیا: آپؐ پر تو قرآن نازل ہوتا ہے' ہم آپؐ کے سامنے قرآن مجید کیا پڑھیں! ارشاد ہوا: میں اسے دوسروں سے سننا پسند کرتا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ نساء کی آیت:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا ۝

"پس اُس وقت کیا ہو گا جب ہم ہر امت کے اندر سے ایک شہید لائیں گے اور تم کو ان لوگوں پر شہید بنائیں گے۔" (النساء: ۴۱)

تلاوت کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: رک جاؤ۔ اور اس وقت آپ کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سلسلہ جاری تھا۔(۶)

۵۔ سیرت النبیؐ جلد اول ص ۲۲۲

۶۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۷۵۹

حضرت ابراہیمؑ کے متعلق اللہ نے فرمایا کہ انہوں نے اپنی قوم کے بارے میں کہا ہے:۔

رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ.....

"پروردگار' ان بتوں نے اکثر لوگوں کو گمراہ کر دیا ہے' پس جس نے میری متابعت کی وہ مجھ سے ہو گا"۔ (ابراہیم:۳۶)

اور حضرت مسیحؑ کا قول ہے کہ

اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۚ وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

"اگر تو ان کو عذاب دے گا تو یہ تیرے ہی بندے ہیں اور اگر معاف کرے گا تو بیشک تو عزت و حکمت والا ہے"۔ (المائدہ:۱۱۸)

عبداللہؓ بن عمروؓ بن عاص روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ آیتیں تلاوت کیں تو آپؐ پر عجیب تاثر ہوا۔ اور آپؐ اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھا کر "اَللّٰهُمَّ اُمَّتِيْ اُمَّتِيْ" کہنے لگے اور رونے لگے۔ (۷)

ان واقعات اور آپؐ کی عملی زندگی سے یہ بات اچھی طرح عیاں ہو گئی کہ خود رسول کریم ﷺ پر قرآن حکیم کا کافی گہرا اثر تھا۔

مستدرک حاکمؒ سے علامہ سیوطیؒ حضرت عبداللہؓ بن عباسؓ کے حوالہ سے تحریر فرماتے ہیں کہ: "ولید بن مغیرہ بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے اس کو قرآن کا کوئی حصہ پڑھ کر سنایا۔ اس سے اس پر رقت طاری ہوئی مگر جب ابوجہل کو اس کی اطلاع ہوئی تو اس نے کہا: چچا جان! آپ کی قوم آپ کو مال و دولت کا ذخیرہ دینا چاہتی ہے تاکہ آپ محمد (ﷺ) کے پاس جا کر ان کی باتیں نہ سنیں۔ ولید نے کہا: قریش کو معلوم نہیں کہ میں ان میں سب سے زیادہ دولت مند ہوں۔ ابوجہل نے کہا: تو پھر محمد (ﷺ) کے متعلق ایسی باتیں کہئے جن سے قریش کو یقین ہو جائے کہ آپ کو ان سے نفرت و بیزاری ہے۔ ولید نے کہا: مجھ سے زیادہ شعر و سخن کا ماہر اور نقاد کون ہو سکتا ہے' مگر خدائے ذوالجلال کی قسم ہم لوگ اس کے متعلق جو کچھ کہتے ہیں بالکل غلط ہے' اس کے کلام کو شعر و سحر سے کوئی تعلق

۷۔ صحیح مسلم باب بکاء النبی ﷺ لامتہ

نہیں' اس میں حلاوت و شیرینی ہے اور وہ مفید و بار آور اور غالب آنے والا ہے' اس پر غالب نہیں ہوا جا سکتا' وہ دوسروں کو پاش پاش کر ڈالے گا۔ ابو جہل نے کہا: آپ کی قوم کبھی ان باتوں کو پسند نہیں کر سکتی اور نہ وہ آپ سے خوش ہو سکتی ہے۔ ولید نے کہا اچھا مجھے سوچ بچار کرنے کا موقع دو۔ چنانچہ اس نے غور و فکر کے بعد کہا: هٰذَا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ (یہ ایسا جادو ہے جو پہلے لوگوں سے نقل ہوتا چلا آرہا ہے)(۸) (جاری ہے)

۸۔ الاتقان ج ۲ ص ۱۱۷

بقیہ: لغات و اعراب قرآن

مِنۢ بَعْدِهٖ ، مِنۢ بَعْدِهٖ ، مِن بَعْدِهٖ / وَ اَنْتُمْ ، اَنْتُمْ ، اَنْتُمْ / ظٰلِمُوْنَ ، ظٰلِمُوْنَ ، ظٰلِمُوْنَ ، ظٰلِمُوْنَ / ثُمَّ / عَفَوْنَا ، عَفَوْنَا ، عَفَوْنَا / عَنْكُمْ ، عَنْكُمْ ، عَنْكُمْ / مِّنۢ بَعْدِ (مثل سابق) ذٰلِكَ ، ذٰلِكَ ، ذٰلِكَ / لَعَلَّكُمْ ، لَعَلَّكُمْ / تَشْكُرُوْنَ ، تَشْكُرُوْنَ ، تَشْكُرُوْنَ ، تَشْكُرُوْنَ / وَ اِذْ ، اِذْ / اٰتَيْنَا ، اٰتَيْنَا ، ءَاتَيْنَا ، اٰتَيْنَا / مُوْسَى ، مُوْسَى ("س" کو آگے ملانے کے لیے ہر جگہ صرف فتحہ ہی دی جاتی ہے) / الْكِتٰبَ ، الْكِتٰبَ ، الْكِتٰبَ / وَالْفُرْقَانَ ، الْفُرْقَانَ ، الْفُرْقَانَ ، الْفُرْقَانَ / لَعَلَّكُمْ / تَهْتَدُوْنَ ، تَهْتَدُوْنَ ، تَهْتَدُوْنَ /

حضرت سلطان المشائخ رح کی

تفسیر قرآن کریم پر گہری نظر(۲)

ـــــــــ مولانا سید اخلاق حسین قاسمی ـــــــــ

فضائل کی موضوع روایات

علامہ زمخشری نے (اعتزالیت سے قطع نظر) ہر فن میں اپنی جلالت کا لوہا منوایا ہے۔ اسرائیلی روایات سے بھی اپنا دامن بچانے میں انہوں نے بڑی احتیاط اختیار کی ہے' مگر تعجب ہوتا ہے کہ علامہ نے قرآن کریم کی سورتوں کے فضائل میں ضعیف روایات کو بغیر کسی تأمل کے نقل کر دیا ہے۔

زمخشری کے بعد امام بیضاوی ہیں' ان کی محققانہ شان بھی ہر فن میں اپنی عظمت کو تسلیم کراتی ہے اور معتزلانہ تصورات کی تردید میں بھی قاضی صاحب کسی اہلِ سنت مفسر سے پیچھے نہیں ہیں' مگر فضائل کی موضوع روایات کے نقل کرنے میں قاضی صاحب علامہ زمخشری کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ قاضی صاحب بڑے صاحبِ دل عالم تھے' صاحبِ کرامت تھے' ضعیف روایات نقل کرنے کے معاملہ میں قاضی صاحب کو ایک مخلص عالم قرار دے کر معذور قرار دیا گیا ہے۔ صاحبِ کشف الظنون نے لکھا ہے کہ قاضی صاحب ایک صاحب اخلاص آدمی تھے' وہ لوگوں میں قرآن کریم کا ذوق و شوق پیدا کرنا چاہتے تھے' اس لئے انہوں نے اس باب میں چشم پوشی سے کام لیا۔ (جلد اول' ۱۲۷)

اس دور کے مشائخ صوفیہ کے سامنے یہی دو تفسیریں رہی ہیں' اس لئے ان حضرات کا کلام فضائل کی ان احادیث سے متأثر ہوا ہے۔ البتہ صاحب سیر الاولیاء امیر خورد نے شیخ علیہ الرحمۃ کے حوالے سے بعض احادیث و آثار ایسے نقل کئے ہیں جو فوائد الفواد والے محققِ حدیث اور عصمتِ نبوت کا نہایت پاکیزہ اور بلند مذاق و مشرب رکھنے والے شیخ کے شایانِ شان نظر نہیں آتے۔ ان میں ایک تفسیری اثر و روایت وہ ہے جو منافقین اور نو مسلم یہودیوں نے پھیلائی۔ یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اور سرور کونین ﷺ کے

درمیان محبت کا افسانہ کذب و افتراء۔ اسی قسم کی روایات و آثار کو دلیل قرار دے کر پاکستان کے مشہور عالم جناب پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے "تاریخ تصوف" میں چشتی تصوف میں الحاق و اضافہ اور باطنیت و شیعیت کی ملاوٹ کا دعویٰ کیا ہے۔ ناچیز نے ایک عنوان کے تحت اس پر مفصل بحث کی ہے۔

تصوف کی اشاراتی تفسیریں

شیخ علیہ الرحمۃ تفسیر قرآن کے باب میں اہل سنت مفسرین و محدثین کے مسلک پر قائم تھے اور تصوف کی اشاراتی تفاسیر کے لطائف بھی آپ کے افادات میں راہ نہیں پاتے تھے۔ اور تفسیر قرآن کا نازک باب اسی احتیاط کا مقتضی تھا۔ مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں مثالوں اور حکایتوں کے ذریعہ پند و موعظت کے دفتر کے دفتر تحریر کر دیئے ہیں لیکن مولاناؒ تفسیر کے معاملہ میں محدثین و فقہاء کے مسلک کی ترجمانی کرتے ہیں۔۔

معنیٔ قرآں ز قرآں پُرس و بس
وز کسے کاتش زدست اندر ہوس
پیشِ قرآں گشت قربانی و پست
تاکہ عینِ روحِ قرآں شدہ است

یعنی قرآن کا مطلب قرآن سے پوچھو اور بس۔ ورنہ اگر تم ادھر ادھر ہوئے تو ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ قرآن کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دو تاکہ تم قرآنی روح میں ڈھل جاؤ۔

اشاراتی تفسیروں میں ایک تفسیر مشہور عارف باللہ حضرت شیخ محی الدین ابن عربی (۵۶۸ھ) کی ہے اور ایک تفسیر مولانا رومی کے ہم عصر ابو محمد شیرازی (وفات ۶۰۶ھ) کی۔ صوفیہ کی اشاراتی تفسیروں کے متعلق اہل سنت کے عقائد کی مشہور کتاب "العقائد النسفی" میں لکھا ہے:۔

"نصوص کو ان کے ظاہر پر محمول کیا جائے گا' ظاہری معنیٰ سے عدول کر کے ایسے معانی مراد لینا جن کا دعویٰ باطنیہ فرقہ کے لوگ کرتے ہیں' دہریت اور الحاد ہے۔" (ص ۱۴۳)

تاویلِ بعید کی مذمت محققین صوفیاء کے ہاں

مولانا رومیؒ قرآن کریم کی تفسیر کی اہمیت کو سمجھتے تھے کہ اس بنیادی کتابِ ہدایت میں من مانی تاویلات کا دروازہ کھول دیا گیا تو اصل تعلیماتِ دین کی شکل و صورت بدل سکتی ہے، جس قسم کی تاویلات قادیانی اور مرزائی فرقہ کی طرف سے کی جاتی ہیں۔ اس لئے مولانا فرماتے ہیں۔

کردۂ تاویل حرفِ بکر را
خویش را تاویل کُن نے ذکر را
بد ہوا تاویلِ قرآں مے کنی
پست و کژ شد از تو معنی سنی
صاحبِ تاویل باطل چوں بگس
وہم اُو بولِ خر و تصویرِ خس

یعنی اپنے آپ کو بدل، قرآن کریم کو کیوں بدلتا ہے؟ باطل تاویل جو شریعت کے مسلّمہ عقائد و اصول کے خلاف ہو اس کی مثال بولِ خر کی طرح گندی اور ذلیل ہے۔

گمراہ فرقے اپنے باطل نظریات کو سہارا دینے کی غرض سے حضرات صوفیاء کرام کے اشاراتی تصورات کو استعمال کرتے ہیں۔ مولانا رومیؒ نے اس کی مذمت کی ہے۔

موضوع تفسیری روایت کی تاویل

حضرت سلطان المشائخ رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً کی شان نرالی تھی، آپ دل کے صوفی تھے اور دماغ کے فقیہ تھے ---- اور جس مقام پر دل اور دماغ کی کش مکش ہو جاتی تھی، آپ پوری قدرت اور مہارت سے دونوں میں مصالحت کرا دیتے تھے۔ اب اس نزاکت کو سمجھے کون؟ غور کیجئے! ایک موقعہ پر آپ نے سورۃ النازعات کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرمایا: "جو شخص نماز عصر کے بعد سورۃ النازعات کی تلاوت کرتا ہے اسے حق تعالیٰ زیادہ دیر تک قبر میں نہیں رکھتا اور وہ ایک نماز کی مقدار سے زیادہ قبر میں نہیں ٹھہرتا۔ حضرت شیخؒ

نے یہ احتیاط کی کہ اسے حدیث نہیں فرمایا' حالانکہ یہ بشارت فضائلِ قرآن کی انہی موضوع روایات میں سے ہے جو مفسرین نے نقل کی ہیں۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے عام مسلمانوں کو ترغیب دینے کے خیال سے اسے نقل ضرور کر دیا' اور جس جذبہ سے کیا وہ جذبہ آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی صورت میں ظاہر ہو گیا۔۔۔۔ شیخ ؒ پر رقت طاری ہو گئی' جو اس بات کی علامت تھی کہ یہ فضیلت بیان کرنے والا اس وقت خشیتِ الٰہی سے مغلوب ہے اور سورۃ "النازعات" کے معانی اور مطالب (موت کی سختی اور عالمِ نزع کی وحشت) اس کے دل پر طاری ہیں۔ پھر ایک عقلی سوال شیخ ؒ کے دل میں پیدا ہوا جو ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہو سکتا ہے جو عقل و فہم کے ساتھ اس فضیلت کو پڑھے گا۔

"فرمود کہ کسے کہ در گور نماند چگونہ باشد؟۔۔۔ گفت آنچناں باشد کہ روح بکمال مے رسد' چوں روح کامل شد قالب را جذب مے کند! (جلد ۲' مجلس ۳۱' ص ۴۶۳)

یعنی فرمایا کہ جو شخص قبر میں نہیں رہتا تو یہ کیسے ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ اس طرح ہوتا ہے کہ جب روحِ انسانی کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم و قالب کو جذب کر لیتی ہے۔ علماء متکلمین اور اہل عقل محدثین نے اس بات کو اس طرح بیان کیا ہے کہ روح انسانی جب کمال کو پہنچ جاتی ہے تو وہ جسم کی مادیت پر غالب آ جاتی ہے اور جسم پر روح کے آثار اور روح کی کیفیات (لطافت اور نورانیت) کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اس مفہوم میں جسم قبر سے غائب ہو جاتا ہے۔ امام ولی اللہ محدث دہلوی ؒ نے اس مسئلہ پر خاص طور پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی وضاحت کے لئے عالمِ مثال کی اصطلاح وضع کی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ کا یہ باب مطالعہ کے قابل ہے جس سے عالمِ برزخ اور عالمِ قبر کے بارے میں جو عقلی اشکالات پیدا ہوتے ہیں وہ دور ہو جاتے ہیں۔

خواجہ حسن ؒ کا تفسیر میں تحقیقی ذوق

سائل اور مجیب (خواجہ حسن ؒ اور شیخ علیہ الرحمۃ) دونوں کی نظر قرآن کریم پر بھی گہری تھی اور اسی لئے سوال و جواب میں تفسیر قرآن کے اہم نکات واضح ہو جاتے تھے۔ چنانچہ شیخ علیہ الرحمۃ نے خواجہ جلال الدین تبریزی ؒ کے حوالے سے یہ واقعہ نقل فرمایا کہ

کسی نے آپ سے سوال کیا کہ ایک شخص روزہ تو رکھتا نہیں' البتہ سحری کا کھانا کھاتا ہے تو اس شخص کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: اسے سحری کے ساتھ دن اور رات کا کھانا بھی کھانا چاہئے' البتہ اس کھانے سے جو قوت اسے حاصل ہو اسے خدا کی عبادت میں صرف کرنا چاہئے اور گناہوں سے بچنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال و جواب نفلی روزہ سے متعلق تھا' ورنہ فرض روزہ کا رکھنا تو لازمی ہے۔ خواجہ حسنؒ بولے : قرآن کریم کی اس آیت کا یہی مطلب ہے: "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ" (المومنون:۵۱) "پاکیزہ چیزیں کھاؤ"... شیخ علیہ الرحمۃ نے اس آیت کا دوسرا ٹکڑا ارشاد فرما کر اسے مکمل کیا۔ فرمایا : پوری آیت یہ ہے : "كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا" "پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو"۔ خواجہ حسن نے اصحابِ کہف کے قول کا حوالہ دے کر پوچھا کہ اس آیت میں "طیّبات" کے معنی پاکیزہ ہیں تو اصحابِ کہف کے اس قول کے کیا معنی ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی کو کھانا لینے بازار بھیجا اور اس سے کہا : "فَلْيَنْظُرْ أَيُّهَا أَزْكَىٰ طَعَامًا" (کہف : ۱۹) "وہ (کھانا لانے والا) یہ دیکھے کہ کون سا کھانا پاکیزہ ہے"۔ عربی لغت کے اعتبار سے "طَیِّبَات" اور "اَزْکٰی" دونوں کا مفہوم پاکیزہ ہے اور اہل تراجم نے دونوں جگہ پاکیزہ ترجمہ کیا ہے۔ خواجہ حسن کے سوال کا مطلب یہ تھا کہ دونوں جگہ ایک ہی مفہوم ہے یا دونوں میں کوئی فرق ہے؟ شیخ علیہ الرحمۃ نے بڑا لطیف فرق بیان کیا اور کہا "طعامے خواستند کہ طبائع بر آں مائل باشند"... یعنی ان کی مراد مرغوبِ طبع کھانا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ کھانا لانے والا ہمارا ساتھی ہے' وہ جانتا ہے کہ ہمیں کون سا کھانا پسند اور مرغوب ہے' وہی کھانا بازار سے خرید لائے۔ اصحاب کہف ۳۰۹ برس کے بعد اس کرامتی نیند سے جاگے تھے اور اس شہر کی دنیا اتنے عرصے میں بالکل بدل چکی ہوگی' اس لئے انہوں نے اپنے رفیق سے کہا کہ جو کھانا ہمیں مرغوب ہے وہ خرید کر لانا' خدا جانے اب بازار میں کس کس قسم کے کھانے پک رہے ہوں۔

زمخشری جیسے نکتہ سنج مفسر نے "اَزْکٰی" کو "حلال' طیب' اکثر اور اَرخص" (سستا) کے معنی میں لیا ہے۔ تفسیر مدارک میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ اثر نقل کیا گیا ہے کہ اس شہر کے لوگ بتوں کے نام پر ذبح کرتے تھے' اس لئے اصحاب کہف نے اپنے رفیق کو

ہدایت کی کہ وہ ایمان والوں کا حلال ذبیحہ خرید کر لائے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اصحاب کہف کی یہی مراد ہوتی تو قرآن کریم کے پاس لفظ "حلال" موجود ہے' وہ سیدھا اس لفظ کو استعمال کرتا۔ اسی طرح علامہ زمخشری نے جن الفاظ سے تفسیر کی ہے وہ بھی قرآن کریم اور عربی لغت میں موجود ہیں' قرآن کے لئے ان الفاظ کا استعمال کرنا کیا مشکل تھا؟ قرآن کریم میں کئی جگہ "حلال اور طیب" (حَلٰلًا طَیِّبًا) دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا گیا ہے (البقرہ : ۱۶۸ اور المائدہ : ۸۸)--- مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ محاورۂ عرب ہے' اہل عرب دونوں لفظوں کو ساتھ ساتھ بطور تاکید کے بولتے تھے۔ اور ایک قول مفسرین کا یہ ہے کہ طیّب بمعنی "مستلذ" (جس سے کھانے والے کو لذت حاصل ہو) ہے (جلالین ص ۲۴) کیونکہ ہر حلال چیز سے ہر شخص کو لذت حاصل نہیں ہوتی اور ہر حلال چیز ہر شخص کے لئے مرغوب طبع نہیں ہوتی۔ حضرت شیخ علیہ الرحمۃ نے سورۂ کہف کے لفظ "ازکیٰ" کو "مستلذ" (مرغوب و پسندیدہ) کے معنی میں لے کر موقع و محل کی رعایت کی طرف اشارہ کیا۔

اب ایک سوال یہ ہے کہ کیا قرآن کریم میں "اَزْکیٰ" کا لفظ پسندیدہ و مرغوب کے مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے؟ اس ناچیز کے خیال میں سورۃ النور کی آیت ۲۹ میں "اَزْکیٰ" کے لفظ میں یہ مفہوم موجود ہے۔ آیت یہ ہے :

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ وَ یَحْفَظُوْا فُرُوْجَھُمْ' ذٰلِکَ اَزْکیٰ لَھُمْ' اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ بِمَا یَصْنَعُوْنَ○

"(اے نبی ﷺ) آپ ایمان والوں سے فرمادیں کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں' یہ بات ان کے حق میں زیادہ پاکیزگی کی ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ ان کے کاموں کی خبر رکھتا ہے"۔

غیر محرم عورتوں سے نگاہیں نیچی رکھنا اور اپنی شرمگاہوں کو چھپا کر رکھنا' یہ بات اخلاقی پاکیزگی کی بھی ہے اور ہر انسان طبعًا اسے پسند بھی کرتا ہے اور مرغوب بھی رکھتا ہے۔ کون ہے جو دوسروں کے سامنے ننگا ہونا پسند کرے یا دوسروں کو ننگا دیکھنا پسند کرے؟ ہر شخص بشرطیکہ فطرتِ سلیم رکھتا ہو نہ دوسروں کی عورتوں کو گھورنا پسند کرے گا اور نہ اس بات کو

پسند کرے گا کہ اس کی ماں بہنوں کو دوسرا گھور کر دیکھے۔ شیخ علیہ الرحمۃ نے اصحاب کہف کے مرغوب کھانے کے بارے میں علماء تفسیر کا ایک قول نقل کیا ہے جو یہ ہے : "بقول بعضے مقصود ازاں طعام برنج بودہ است" یعنی بعض علماء کے نزدیک ایک مرغوب کھانے سے چاول مراد ہیں۔

تفسیر میں اجتہادی بصیرت

شیخ علیہ الرحمۃ تفسیر قرآن میں اجتہادی بصیرت رکھتے تھے' چنانچہ ایک مجلس میں حضرت شیخ علیہ الرحمۃ نے صدقہ کی آیاتِ قرآنی سے فقہی مسائل کا استنباط کرنے کے ساتھ ساتھ لفظ "صدقہ" کی لغوی حقیقت کے تعلق سے عورت کے مہردین کے بارے میں ایک نہایت حکیمانہ تبصرہ فرمایا۔ صَدَقَۃ (دال کا زبر) اور صُدُقَۃ (دال کا پیش) یہ دونوں لفظ ایک ہی مادہ (صدق) سے مشتق ہیں۔ "صَدَقہ" کے معنی خیرات اور "صُدُقہ" کے معنی مہر دین۔ "صِدق" کے معنی سچائی کے ہیں۔ حضرت شیخ علیہ الرحمہ نے اصل لفظ کے مفہوم کی مناسبت سے مہردین کی حقیقت پر روشنی ڈالی۔ فرمایا:

"ایں ہر دو معنی از صدق محبت اقتضاء مے کند ..... کہ آں نیز صدقہ است"۔

یعنی (صَدَقہ اور صُدُقہ) یہ دونوں چیزیں سچی محبت کا تقاضا کرتی ہیں' یعنی جو شخص کسی عورت کے ساتھ شادی کرے تو اسے چاہئے کہ سچی محبت کے ساتھ زندگی گزارے۔ ازدواجی تعلق قائم کرنے کے لئے عورت کا حق مہر ایک واسطہ ہے اور اس کا نام شریعت نے صُدُقہ رکھا ہے جو صدق سے ہے۔ اور جو چیز ایک مسلمان راہ خدا میں خیرات کرتا ہے تو وہ بھی یہ سرور عالم ﷺ کی محبت میں خرچ کرتا ہے۔ اسی تصور سے اس خیرات کو صَدَقہ کہا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے ہدایت کی ہے : وَ آتُوا النِّسَاءَ صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً (النساء:۴) یعنی "عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے ادا کرو"۔ عربی میں "نِحلۃ" کہتے ہیں تحفہ اور ہدیہ کے طور پر دی جانے والی چیز کو۔ "نَحل" شہد کی مکھی کو کہتے ہیں' جو بغیر کسی معاوضہ کے

بڑی محنت اور سلیقہ کے ساتھ مخلوق کے لئے شہد کا تحفہ جمع کرتی ہے۔ قرآن کریم نے رشتہ نکاح کو محبت اور پیار کا رشتہ قرار دیا ہے:

لِتَسْكُنُوْٓا اِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً (الروم : ۲۱)

"(اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تمہاری بیویاں پیدا کیں) تاکہ تم ان سے اطمینان و چین حاصل کرو اور تمہارے درمیان اس رشتہ کو محبت و پیار کا ذریعہ بنادیا"۔

شیخ علیہ الرحمۃ نے صُدُقہ (مہر) کے حوالہ سے رشتۂ نکاح کی عظمت اور اس کا اخلاقی مرتبہ بیان کیا اور اس واسطہ سے عورت کے اس اخلاقی مقام کی طرف اشارہ فرمایا جو اسلام نے عورت کو عطا کیا ہے۔

یہ سمجھنا کہ صوفیائے ربانی نے مسلم معاشرہ کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں فرمائی خلافِ واقعہ ہے' البتہ ان حضرات کا معمول باطنی اخلاق کا تزکیہ ہے اور باطن کے ذریعہ ظاہر کی درستگی پر نظر رکھی جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی خارجی دباؤ کے ذریعہ اگر انفرادی اعمال اور معاشرتی زندگی میں سدھار آجاتا ہے تو وہ پائیدار نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (الرعد:۱۱)

یعنی "اللہ تعالیٰ کسی قوم اور کسی گروہ کی حالت میں (اچھی حالت ہو یا بری حالت) تغیر اور تبدیلی پیدا نہیں کرتا جب تک کہ وہ گروہ اپنے نفس (باطن' عقیدہ اور تصور) کو نہیں بدلتا"۔ مطلب یہ ہے کہ تبدیلی بری حالت سے اچھی حالت کی طرف ہو یا اچھی حالت سے بری حالت کی طرف' اس وقت وقوع میں آتی ہے جب عقیدہ اور باطن میں فرق پڑتا ہے۔ اچھے عقیدہ اور حسن باطن سے اچھی زندگی وقوع میں آتی ہے اور برے عقیدہ اور سوءِ باطن سے بری زندگی جنم لیتی ہے۔ بقول حالی۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

شریعت میں صداقت کا مقام

صداقت اور صدق و سچائی' اللہ تعالیٰ کے حقوق میں ہو یا بندوں کے باہمی حقوق میں' عبادتِ الٰہی کی حقیقی روح ہے۔ صوفیائے ربانی نے تصوف و احسان کی راہ سے انسانی زندگی کو صدق و صداقت کے نور سے روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہی ان حضرات کا مشن و منصب تھا۔ زندگی ریاکاری' دکھاوے' پبلسٹی اور تکلف سے پاک ہو جائے' یہی زندگی آخرت میں سرفراز ہوگی:

قَالَ اللّٰہُ ھٰذَا یَوْمُ یَنْفَعُ الصّٰدِقِیْنَ صِدْقُھُمْ لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا اَبَدًا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَ رَضُوْا عَنْہُ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ○ (المائدۃ:۱۱۹)

"اللہ تعالیٰ (قیامت کے دن) فرمائے گا کہ یہ ہے وہ دن جس میں صادق بندوں کو ان کی صداقت کام آئے گی' ان کے لئے باغات ہیں جن میں نہریں جاری ہیں' وہ اس (دائمی عیش و مسرت کی زندگی) میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور یہ بھی اس سے راضی ہوئے۔ یہی ہے عظیم کامیابی"۔

دینی اخوت کی فضیلت قرآن کریم میں

شیخ علیہ الرحمۃ نے نسبی اخوت سے دینی اخوت کو افضل بتاتے ہوئے فرمایا: "نسبی اخوت اس وقت کام نہیں دیتی جب دو بھائیوں میں سے ایک بھائی کافر ہو۔ کافر بھائی کو مسلمان بھائی کا ترکہ نہیں ملتا۔ دینی اخوت دنیا میں اور دنیا کے بعد آخرت میں بھی قائم رہتی ہے"۔ پھر آپ نے قرآن کریم کی آیت تلاوت فرمائی:

اَلْاَخِلَّاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ○

(الزخرف:۶۸)

"قیامت کے دن دوست دوست کا دشمن ہو جائے گا سوائے متقی لوگوں کے"

یعنی متقیوں کے درمیان دوستی کا رشتہ قائم رہے گا۔ پھر فرمایا: "جو دوستی برائی اور گناہ کے

کاموں میں قائم ہوگی وہ قیامت کے دن دشمنی میں بدل جائے گی"۔ اس کے بعد آپ نے یہ شعر پڑھا۔

ترا دشمناں نند ایں دوستاں
کہ یارند در باد و بوستاں

یعنی یہ شراب و باغ کے دوست تیرے دوست نہیں دشمن ہیں۔ (جلد ۲، مجلس ۳۶، ص ۴۸۳)۔۔۔ مولانا جلال الدین رومی (۶۹۴ھ) نے مثنوی میں اس قسم کی دوستی پر کہا ہے

چوں یَفِرُّ الْمَرْءُ آید مِنْ اَخِیہ
یَھرِبُ الْمَوْلُود یوماً مِن اَبِیہ
زاں شود ہر دوست آں ساعت عدو
کہ بت تو بود و از رہ مانع او
آں بگو یک روز من پیروز شد
آنچہ فردا خواست شد امروز شد
نازنیں یارے کہ بعد از مرگِ تو
رشتۂ یاریِ او گردد سہ تو
آں مگر سلطاں بود شاہِ رفیع
یا بود مقبول سلطان و شفیع

یعنی جس دن بھائی اپنے بھائی کو دیکھ کر بھاگے گا اور بچہ اپنے باپ کو دیکھ کر بھاگے گا، اس دن ہر دوست دشمن ہو جائے گا، کیونکہ کبھی تو نے اسے بت بنا کر پوجا ہے اور کبھی اس نے تیرا راستہ روکا ہے۔ ایسے دوست سے آج ہی پیچھا چھڑا لے اور جو کل ہونا ہے وہ آج ہی ہو جائے تو بہتر ہے۔ اور اس حسین و نازنین کو اپنا دوست بنا جس کی دوستی مرنے کے بعد تین گنا بڑھ جائے، یعنی اس عظیم و جلیل ہستی خداوند عالم کو اور اس کے مقبول بندوں اور اس کی بارگاہ میں سفارش کرنے والے اہل اللہ کو، جن کی دوستی آج کی دوستی سے دو چند اور سہ چند ہو کر تیرے کام آئے۔

●●

برِّعظیم پاک وہند میں علمِ حدیث

تحریر: عبدالرشید عراقی

علمِ حدیث

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث کی حیثیت اس کی سب سے بڑی شریان کی ہے' جو اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ان کے لئے تازگی کا سامان پہنچاتی رہتی ہے۔ آیات کا شان نزول اور ان کی تفسیر' احکام القرآن کی تشریح (تعیین)' اجمال کی تفصیل' عموم کی تخصیص' مبہم کی تعیین' سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حامل قرآن محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور حیات طیبہ اور اخلاق و عادات مبارکہ اور آپ کے احوال و اقوال اور آپ کے سنن و مستحبات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ' صحابہ کرامؓ کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہے کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں میں ہمیشہ کے لئے موجود و قائم ہے۔ اور ان شاء اللہ تاقیامت رہے گا۔(۱)

برِّعظیم میں صحابہؓ و تابعینؒ کی آمد

برعظیم پاک و ہند میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آمد کا سلسلہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہد میں شروع ہوا۔ حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) لکھتے ہیں:

"عہد فاروقی میں سندھ اور ہندوستان کے حدود و اطراف میں صحابہؓ و تابعینؒ اور اتباع تابعینؒ کی آمد ہوئی اور ان کی تشریف آوری کا سلسلہ عباسی دور کی ابتداء تک جاری رہا۔ ان تینوں طبقوں کے انفاس گرم سے اس ملک کی فضا میں دین و ایمان کی حرارت پیدا ہوئی۔"(۲)

خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ کا دور آتا ہے۔ اس دور میں بھی برِّ عظیم پاک و ہند کے مسلمانوں کی زندگی کا ہر پہلو نہایت تابناک تھا اور وہ ہر میدان میں عالم اسلام کے شانہ بشانہ چلتے تھے۔ ہر قسم کے علوم و فنون اور علماء و فضلاء سے ان کی محفلیں آباد تھیں۔ خلفائے بنو امیہ کا دستور تھا کہ وہ مفتوحہ ممالک میں علماء' فقہاء' محدثین' عباد و زہاد اور صلحاء کو بھیجتے تھے اور یہ حضرات اپنے اپنے طریقہ کے مطابق دینی اور علمی خدمات سرانجام دیتے تھے۔ اس وقت احادیث و آثار کی باقاعدہ تدوین نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی "اخبرنا و حدثنا" کا طریقہ رائج تھا۔ اموی دور میں ۴۰ھ تا ۹۹ھ یہی حال رہا۔ اس کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز (م ۱۰۱ھ) نے احادیث و سنن کی تلاش و تدوین کے احکام جاری کئے۔ چنانچہ حدیث کے کئی مجموعے تیار ہوئے اور پہلی صدی ہجری کے آخر اور دوسری صدی ہجری کی ابتداء میں باقاعدہ تدوین حدیث کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ ۱۴۰ھ اور ۱۵۰ھ کے درمیان پورے عالم اسلام میں احادیث و آثار جمع کئے گئے۔ اموی دور کا یہ پودا عباسی دور کی ابتداء میں پوری طرح بار آور ہو گیا اور باقاعدہ "اَخْبَرَنَا وَ حَدَّثَنَا" کے ساتھ روایت کا سلسلہ چل نکلا۔ اس سے پہلے صحابہ کرامؓ و تابعین عظامؒ اپنے اپنے حلقوں میں اپنے طور پر کتاب و سنت کی تعلیم و تلقین انجام دیتے تھے۔ چنانچہ برِّ عظیم پاک و ہند میں بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ یہاں بھی رواۃ حدیث بڑی تعداد میں آ گئے۔ اور اس زمانہ کے مطابق انہوں نے چلتے پھرتے مجالس و محافل اور غزوات و جہاد میں حسب ضرورت احادیث بیان کیں۔

حافظ ابن کثیر (م ۷۷۴ھ) اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

> "بنو امیہ کے دور میں جہاد کے اندر فوجوں میں کبارِ تابعین سے صلحاء و اولیاء اور علماء ہوا کرتے تھے۔ ہر فوج کے ساتھ ان کی بڑی تعداد ہوا کرتی تھی جن سے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی مدد فرماتا تھا"۔ (۳)

جس طرح عالم اسلام میں کتاب و سنت کی روشنی میں یہ کام ہوتا تھا' اسی طرح برِ عظیم پاک و ہند میں اسلامی قوانین کے سلسلہ میں کتاب و سنت و آثار صحابہؓ کو پیش نظر رکھا جاتا تھا۔

برِّعظیم میں پہلے تابعی کی آمد

۹۳ھ میں مسلمانوں نے سندھ پر حملہ کیا اور اس کو فتح کیا۔ اس کے بعد یہ ملک تیسری صدی ہجری کے شروع تک عربوں کے قبضہ میں رہا۔ ۱۵۹ھ میں خلیفہ مہدی کے حکم سے جو فوج برِّعظیم کی طرف روانہ ہوئی اس میں حضرت ربیع بن السعدی البصری (م ۱۶۰ھ) بھی شامل تھے' اور یہ تابعی تھے۔ ان کے بارے میں صاحب کشف الظنون حاجی خلیفہ (م ۱۰۶۷ھ) نے لکھا ہے کہ یہ پہلے شخص تھے جنہوں نے اسلام میں تصنیف کا کام کیا۔ (۴)

ان کے علاوہ ایک اور تابعی جن کا نام حباب بن فضالہ" تھا اور جو آنحضرت ﷺ کے خادم خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے شاگرد تھے ان کے بارے میں امام ذہبی" (م ۷۴۸ھ) نے لکھا ہے کہ وہ ہندوستان آئے تھے۔ (۵)

تبع تابعین میں حضرت اسرائیل بن موسیٰ" جو حضرت امام حسن بصری" (م ۱۱۰ھ) کے شاگرد تھے' تجارت کے سلسلہ میں برِعظیم پاک و ہند کا سفر کرتے تھے اور ان کا لقب "نزیل ہند" تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) نے امام ابن حبان (م ۳۵۴ھ) کے حوالہ سے لکھا ہے:

کان یسافر الی الھند (۶)

"یہ ہندوستان کا (تجارتی) سفر کرتے تھے"۔

پانچویں صدی ہجری میں محدثین کرام کی آمد

۴۱۲ھ میں سلطان محمود غزنوی نے لاہور فتح کیا۔ سلطان کی فوج میں کئی ایک محدث شامل تھے' جن میں ایک محدث شیخ اسمٰعیل" تھے' جو حدیث و تفسیر کے جامع البحرین تھے۔ بے شمار آدمی ان کے ہاتھ پر مسلمان ہوئے۔ انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کی اور لاہور ہی میں ۴۴۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ (۷)

شیخ اسمٰعیل کی وفات کے بعد ۱۵۰ برس تک یہاں کسی محدث کی آمد کا سلسلہ نہ رہا اور برِعظیم میں ایک قسم کا گھپ اندھیرا رہا۔ ساتویں صدی ہجری کے شروع میں "مشارق الانوار" کے مصنف امام حسن بن محمد صنعانی (م ۶۵۰ھ) نے علم حدیث کی روشنی پھیلائی۔

امام حسن بن محمد صنعانی کا سن پیدائش ۵۷۰ھ ہے۔ ابتدائی تعلیم لاہور میں اپنے والد سے حاصل کی' پھر یمن' حجاز اور عراق جاکر علم کی تکمیل کی اور لغت و حدیث کے امام قرار پائے۔ ۶۱۷ھ میں عباسی خلیفہ معتصم کی طرف سے بطور سفیران کا ہندوستان میں تقرر ہوا۔ آپ نے حدیث کی مشہور کتاب مشارق الانوار مرتب کی۔

برِعظیم میں علم حدیث کا فروغ

برِعظیم پاک و ہند میں علم حدیث کا فروغ دسویں صدی ہجری کے آغاز میں ہوا۔ یہ وہ عہد تھا کہ جب مصر و شام و حجاز میں امام الحدیث حافظ محمد بن عبدالرحمٰن سخاویؒ (م ۹۰۲ھ) کے فضل و کمال کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور امام سخاوی کے فیض و افادہ کی کرنیں دنیائے اسلام کے ہر گوشہ میں پڑ رہی تھیں۔ برِعظیم میں حافظ سخاوی کے تلامذہ میں مولانا راجح بن داؤد گجراتی تھے جو ایک نامور محدث تھے۔ ۹۰۴ھ میں احمد آباد میں ان کا انتقال ہوا۔(۸)

دسویں صدی ہجری میں امام شیخ علی متقیؒ (م ۹۷۵ھ) کا نام بہت نمایاں ہے' جن کا تعلق جون پور سے تھا اور ان کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ ان کے اساتذہ میں علمائے حجاز کے نام بھی ملتے ہیں۔ آپ صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ حدیث کی بہت خدمت کی۔ علم حدیث میں آپ کی بہت بڑی خدمت یہ ہے کہ آپ نے امام جلال الدین سیوطی (م ۹۰۱ھ) کی کتاب "جمع الجوامع" کو فقہی ابواب پر مرتب کیا۔

شیخ علی متقیؒ (۹۷۵ھ) کے بعد شیخ محمد طاہر پٹنیؒ کا نام آتا ہے۔ ان کا سن وفات ۹۸۶ھ ہے۔ آپ شیخ علی متقی کے تلامذہ میں سے تھے۔ خدمت حدیث میں ان کی کتاب "مجمع بحار الانوار" ہے اور اس کتاب کا موضوع لغت حدیث ہے۔ اس کے علاوہ اسماء الرجال پر "مغنی" کے نام سے کتاب لکھی۔ "تذکرۃ الموضوعات" کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی جس میں موضوع احادیث کو جمع کیا۔

شیخ محمد طاہر پٹنی کے بعد برِعظیم پاک و ہند میں ایک ایسی ہستی پیدا ہوئی جس نے حدیث کی نشر و اشاعت میں گرانقدر علمی خدمات انجام دیں اور جس کے بارے میں اہل علم نے کہا: "اول کسے کہ تخم حدیث در ہند کشت او بود" اور یہ ہستی حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ

(م ۱۰۵۲ھ) کی ہے۔ خدمت حدیث میں آپ نے حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کی دو شرحیں "لمعات" (عربی) اور "اشعۃ اللمعات" (فارسی) لکھیں' جبکہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے فرزند شیخ نورالحقؒ (م ۱۰۷۳ھ) نے تیسیر القاری کے نام سے صحیح بخاری کی شرح لکھی۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور ان کے خاندان نے علم حدیث کی گرانقدر علمی خدمات سرانجام دیں۔ ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کا دور آتا ہے' جنہوں نے برِّعظیم میں حدیث کی نشرواشاعت اور اس کی ترقی و ترویج میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ان کی حیثیت تاریخ اسلام میں سنگ میل کی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے خدمت حدیث میں امام مالکؒ (م ۱۷۹ھ) کی مشہور کتاب "مؤطا" کی دو شرحیں بنام "المسوّیٰ" (عربی) اور "المصفّیٰ" (فارسی) لکھیں اور اس کے ساتھ آپ نے ایک بہترین اور غیر مسبوق کتاب "حجتہ اللہ البالغہ" تصنیف کی' جس کے متعلق مولوی ابو یحیٰ امام خان نوشہروی (م ۱۹۶۶ھ) لکھتے ہیں:

> "حجتہ اللہ البالغہ دین کی حجت بنی' اس کے ابلاغ نے حق و باطل میں امتیاز کر دیا۔ اس کے ایک ایک لفظ نے تشویق الی السنہ اور تحریض عمل بالحدیث کا درس دیا۔" (۹)

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ (م ۱۱۷۶ھ) کے صاحبزادگان عالی مقام حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ)' مولانا شاہ رفیع الدین دہلویؒ (م ۱۲۲۰ھ) اور مولانا شاہ عبدالقادر دہلویؒ (م ۱۲۳۹ھ) اور آپ کے پوتے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید دہلویؒ (م ۱۲۴۶ھ) نے بھی خدمت حدیث میں گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے خدمت حدیث میں "تنویر العینین فی اثبات رفع الیدین" (عربی) لکھی' جس میں اثبات رفع الیدین کی تمام حدیثیں جمع کر دیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور ان کے صاحبزادگان عالی مقام کے بعد خدمت حدیث میں مولانا شاہ محمد اسحاق دہلویؒ (م ۱۳۶۲ھ) کا نام آتا ہے۔ آپ مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ) کے نواسے تھے۔ ان کی ساری عمر خدمت حدیث میں گزری۔ آخری

عمر میں مکہ معظمہ ہجرت کر گئے' جہاں آپ نے ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔ علامہ سید سلیمان ندوی (م ۱۳۷۳ھ) آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے آپ کے درس میں بڑی برکت عطا فرمائی۔ تمام بڑے بڑے علماء ان کے شاگرد تھے۔ چند رسالے بھی ان کی تصنیف ہیں۔ غدر کے بعد مکہ معظمہ ہجرت کر کے چلے گئے تھے اور وہاں بھی یہ سلسلۂ فیض جاری رہا۔ آخر وہیں ۱۲۶۲ھ میں وفات پائی۔ ان کے تلامذہ میں مولانا امجد علی سہارن پوری' نواب صدر الدین خاں دہلوی' نواب قطب الدین خان جنہوں نے کتب حدیث کا اردو میں ترجمہ کیا ہے' مولانا سید نذیر حسین بہاری دہلوی' مولانا عالم علی مراد آبادی' شیخ محمد صاحب تھانوی' مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مراد آبادی' مولانا قاری عبدالرحمٰن پانی پتی ہیں"۔(۱۰)

مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی کی تحدیث

حضرت مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب دہلوی (م ۱۲۶۲ھ) کے مکہ معظمہ ہجرت کرنے کے بعد شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) دہلی کی مسند تحدیث پر متمکن ہوئے۔ مولوی ابویحییٰ امام خان نوشہروی (م ۱۹۶۶ء) لکھتے ہیں:

"شاہ اسمٰعیل شہید کے اس مسابقت الی الجہاد و فوز بہ شہادت کے بعد ہی دہلی میں الصدر الحمید مولانا شاہ محمد اسحاق صاحب کا فیضان جاری ہو گیا جن سے شیخ الکل میاں صاحب السید نذیر حسین محدث دہلوی مستفیض ہو کر دہلی ہی کی مسند تحدیث پر متمکن ہوئے"۔(۱۱)

حضرت شیخ الکل مرحوم و مغفور نے ۶۰ سال تک حدیث کا درس دیا۔ اور آپ سے بے شمار حضرات نے استفادہ کیا۔ آپ کے تلامذہ میں بعض نے حدیث کی وہ خدمت کی جس کا تذکرہ ان شاء اللہ العزیز رہتی دنیا تک رہے گا۔ برِّ عظیم میں حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین دہلوی اور آپ کے تلامذہ نے حدیث کی جو خدمت کی ہے اس کا اعتراف علمائے عرب نے بھی کیا ہے۔ علامہ رشید رضا مصری (م ۱۳۵۴ھ) لکھتے ہیں:

"اگر ہمارے بھائی علمائے ہند علوم حدیث کی طرف توجہ نہ کرتے تو مشرقی ممالک (یعنی مصر، شام، عراق اور حجاز) میں جو علم دسویں صدی ہجری سے ضعف کا شکار ہو کر ۱۴ویں صدی ہجری کے آغاز تک انتہائی کمزور ہو چکا تھا، بالکل زوال پذیر ہو جاتا۔" (۱۲)

حضرت شیخ الکل مولانا سید محمد نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ) کے جن تلامذہ نے خدمت حدیث میں تصنیف و تالیف کے ذریعہ جو خدمات سرانجام دی ہیں ان میں مولانا محمد ابراہیم آروی (م ۱۳۲۰ھ) نے مشکوٰۃ المصابیح کا اردو ترجمہ طریق النجاۃ کے نام سے کیا۔ مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی (م ۱۲۳۶ھ) نے مشکوۃ المصابیح میں بخاری و مسلم کی مرویات کو علیحدہ جمع کیا اور سواء الطریق (عربی) کے نام سے چار جلدوں میں شائع کیا۔ مولانا شمس الحق ڈیانوی عظیم آبادی (م ۱۳۲۹ھ) نے سنن ابوداؤد کی دو شروح بنام غایۃ المقصود (عربی) ۳۲ جلدوں میں اور عون المعبود (عربی) ۴ جلدوں میں لکھی، سنن دار قطنی کی شرح المغنی کے نام سے لکھی۔ مولانا عبدالرحمٰن مبارک پوری (م ۱۳۵۳ھ) نے جامع ترمذی کی شرح بنام تحفۃ الاحوذی (عربی) چار جلدوں میں لکھی اور اس کے ساتھ ایک علمی و تحقیقی مقدمہ بھی لکھا۔ مولانا حافظ محمد ابوالحسن سیالکوٹی (م ۱۳۲۵ھ) نے صحیح بخاری کی اردو میں شرح ۳۰ جلدوں میں بنام فیض الباری لکھی۔ مولانا عبدالوہاب دہلوی (م ۱۳۵۱ھ) نے مشکوٰۃ المصابیح کا عربی حاشیہ لکھا۔

علمائے غزنویہ میں مولانا عبدالاول غزنوی (م ۱۳۱۳ھ) نے خدمت حدیث میں نصرۃ الباری ترجمہ صحیح بخاری ۸ پارے، اور مشکوٰۃ المصابیح کا حاشیہ اردو میں الفوائد السلفیہ کے نام سے لکھا۔ مولانا عبدالغفور غزنوی (م ۱۳۵۲ھ) نے مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۶۲ھ) کی کتاب تحفۃ الاخبار ترجمہ مشارق الانوار کو فقہی ابواب پر مرتب کیا۔

مولانا وحید الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۳۸ھ) نے خدمت حدیث میں گرانقدر علمی خدمات سرانجام دیں۔ صحاح ستہ بشمول مؤطا امام مالک کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اس میں جامع ترمذی کا ترجمہ آپ کے بڑے بھائی مولانا بدیع الزمان حیدر آبادی (م ۱۳۰۴ھ) نے کیا۔ مولانا وحید الزمان نے حدیث کی ایک لغت بھی مرتب کی جس کا نام اسرار اللغۃ رکھا۔ یہ

کتاب ۲۸ جلدوں میں ہے۔

نواب صدیق حسن خاں قنوجی کی خدمتِ حدیث

محی السنہ مولانا سید نواب صدیق حسن خاں قنوجی (م ۱۳۰۷ھ) کی خدمت حدیث تاریخ اہلحدیث میں ایک زریں باب ہے۔ آپ نے عربی، فارسی، اردو میں ۲۲۲ کتابیں تفسیر، حدیث، عقائد، فقہ، رد تقلید، سیاست، تاریخ و سیر، علم و ادب، اخلاق، تصوف، تردید شیعیت وغیرہ موضوعات پر لکھیں۔ فن حدیث پر آپ کی ۲۲ کتابیں ہیں جن میں چند مشہور کتب یہ ہیں: عون الباری شرح صحیح بخاری (عربی) ۲ جلد

السراج الوہاج شرح مسلم بن حجاج (عربی) ۲ جلد

فتح العلام شرح بلوغ المرام (عربی) مسک الختام شرح بلوغ المرام (فارسی)

اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین (فارسی)

رجال کتب حدیث پر الحطہ فی ذکر الصحاح الستہ (عربی) صحاح ستہ کے فوائد پر۔(۱۳)

حواشی

۱۔ مقدمہ تدوین حدیث، مولانا مناظر حسن گیلانی

۲۔ البدایہ والنہایہ، ج ۹، ص ۸۸

۳۔ البدایہ والنہایہ، ج ۹، ص ۸۷

۴۔ مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۲

۵۔ میزان الاعتدال، ج ۲، ص ۲۰۸

۶۔ تہذیب التہذیب، ج ۱، ص ۲۶۱

۷۔ فہرست ابن ندیم، ص ۱۳۶

۸۔ الضوء اللامع، ج ۳، ص ۲۲۲

۹۔ ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات، ص ۱۴

۱۰۔ مقالات سلیمان، ج ۲، ص ۵۲

۱۱۔ ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات، ص ۹ا

۱۲۔ مقدمہ مفتاح کنوز السنہ

۱۳۔ ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات، ص ۴۱ تا ۵۱

سورۃ البقرۃ

آیات ۵۱-۵۳

(گزشتہ سے پیوستہ)

ملاحظہ: کتاب میں حوالہ کے لیے قطعہ بندی (پیراگرافنگ) میں بنیادی طور پر تین ارقام (نمبر) اختیار کیے گئے ہیں۔ سب سے پہلا (دائیں طرف والا) ہندسہ سورۃ کا نمبر شمار ظاہر کرتا ہے اس سے اگلا (درمیانی) ہندسہ اس سورۃ کا قطعہ نمبر (جو زیر مطالعہ ہے اور جو کم از کم ایک آیت پر مشتمل ہوتا ہے) ظاہر کرتا ہے۔ اس کے بعد والا (تیسرا) ہندسہ کتاب کے مباحث اربعہ (اللغہ، الاعراب، الرسم اور الضبط) میں سے زیر مطالعہ مبحث کو ظاہر کرتا ہے یعنی علی الترتیب اللغہ کے لیے ۱، الاعراب کے لیے ۲، الرسم کے لیے ۳، اور الضبط کے لیے ۴ کا ہندسہ لکھا گیا ہے بحث اللغہ میں چونکہ متعدد کلمات زیر بحث آتے ہیں اس لیے یہاں حوالہ کی مزید آسانی کے لیے نمبر ۱ کے بعد قوسین (بریکٹ) میں متعلقہ کلمہ کا ترتیبی نمبر بھی دیا جاتا ہے۔ مثلاً ۲: ۵: ۱(۳) کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث اللغۃ کا تیسرا لفظ اور ۲: ۵: ۳ کا مطلب ہے سورۃ البقرہ کے پانچویں قطعہ میں بحث الرسم۔ وھکذا۔

۲: ۳۳

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ
اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ
ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى
الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

۲:۳۳:۱ اللغــۃ

[وَاِذْ] کے معنی واستعمال پر کئی دفعہ بات ہوچکی ہے مثلاً البقرہ: ۳۰ [۲:۲۲:۱(۱)] اور اوپر ۲:۳۲:۱ کے شروع میں۔"اور جس وقت"۔

۲:۳۳:۱(۱) [وَاعَـدْنَا] کا مادہ "و ع د" اور وزن "فَاعَلْنَا" ہے (یہاں آسانی کے لیے "واعَدْنا" برسم املائی لکھا گیا ہے۔رسم عثمانی پر آگے "الرسم" میں بات ہوگی) اس مادہ سے فعل مجرد وعَــد ..... یَعِــدُ وَعْــدًا و مَوْعِــدۃً (ضرب سے) آتا ہے اوراس کے بنیادی معنی تو ہیں: ... سے ... کا وعدہ کرنا" (وعدہ خود اسی فعل سے ماخوذ ہے اور اردو میں مستعمل ہے)۔اس فعل کے عموماً دو مفعول آتے ہیں (۱) جس سے وعدہ کیا جائے اور (۲) جس چیز کا وعدہ کیا جائے۔اور عموماً تو دونوں مفعول بنفسہ (بغیر صلہ کے) آتے ہیں جیسے "وعَدَکم اللّٰہُ مغانمَ کثیرۃً" (الفتح: ۲۰) یعنی "اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا"۔بعض دفعہ دوسرے مفعول پر "ب" کا صلہ لگتا ہے۔مثلاً کہتے ہیں: وعَدفلاناً الامرَ و بالامرِ" (اس نے اس کو" اس بات" کا وعدہ دیا)۔قرآن کریم میں یہ (صلے والا) استعمال کہیں نہیں آیا۔بعض دفعہ دوسرا مفعول محذوف ہوتا ہے جو عبارت (سیاق وسباق) سے سمجھا جاتا ہے۔قرآن کریم اس (مفعول ثانی محذوف) کی صرف ایک مثال (النساء: ۱۲۰) میں ہے۔"وعَــد یعــد" اچھے بُرے دونوں طرح کے وعدہ کے لیے استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں اہلِ ایمان کےلیے "جناتٍ" اور کفار کے لیے "نارَجھنــمَ" کے لیے "وعَـدَ" کا لفظ ہی آیا ہے۔عام عربی میں کہتے ہیں: "وعدہ خیرًا/ شرًا۔ یا۔بخیر/ بشرٍ"۔ (اس نے اس سے اچھا یا بُرا وعدہ کیا)

● یہ فعل قرآن کریم میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔صرف فعل مجرد کے مختلف صیغے ، جگہ آتے ہیں۔مزید فیہ کے باب مفاعلہ کے صیغے چار جگہ اور باب تفاعل سے صرف ایک صیغہ آیا ہے۔اس کے علاوہ مجرد اور مزید فیہ سے مصادر اور اسماء مشتقہ ۵ ، مقامات پر وارد ہوئے ہیں۔ان سب پر حسب موقع بات ہوگی۔ان شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "واعَــدنا" اس مادہ (وعــد) سے باب مفاعلۃ کا فعل ماضی صیغہ جمع متکلم ہے۔ اس باب سے فعل "واعَـد ..... یواعِـدُ مُواعَــدۃً" کے معنی ہیں۔ ... سے وعدہ کیا اور ..... نے بھی وعدہ کیا" یعنی "دو آدمیوں نے باہم ایک دوسرے سے وعدہ کیا"۔یہ معنی بابِ مفاعلہ میں عموماً خصوصیت مشارکت پائے جانے کی بناء پر ہیں۔تاہم اس باب میں ہر جگہ "دو" یا "باہم" کا مفہوم ضروری نہیں مثلاً "سَافَرَ (اس نے سفر کیا) یا عاقبَ (اس نے سزا دی) وغیرہ میں باہم کا مفہوم نہیں ہے۔ اور عموماً اس فعل کے بھی دو مفعول آتے ہیں مثلاً کہتے ہیں" واعَـدہ الوقتَ اوالمکانَ (اس نے اس

کو "اس وقت" یا "اس جگہ" کا وعدہ دیا) یعنی اس کے ساتھ جگہ یا وقت مقرر کیا) قرآن کریم میں اس باب سے فعل کے صیغے چار جگہ آئے ہیں اور ہر جگہ دو مفعول کے ساتھ۔ اور زیر مطالعہ آیت بھی ان میں سے ایک ہے۔

● بعض حضرات[1] نے یہاں (زیر مطالعہ آیت میں) بھی "باہم وعدہ" والا مفہوم یوں لیا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے (۴۰ رات کا) وعدہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ "وفا" کرنے کا وعدہ تھا۔ تاہم اس نکتہ آفرینی کی بجائے وہی پہلی بات (کہ واعَدَ یہاں بمعنی وعَدَ ہی ہے) زیادہ بہتر ہے اور اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ "الدوری" کی قراءت میں اسے "وعَدْنا" ہی پڑھا گیا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اردو کے تمام مترجمین نے یہاں "مشارکت" اور "باہم" والی خصوصیت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس (واعَدْنا) کا ترجمہ "ہم نے وعدہ کیا، وعدہ دیا، کر لیا تھا اور ٹھہراؤ کیا" کے ساتھ ہی کیا ہے۔

۲ : ۳۳ : ۱ (۲) [مُوْسٰی] بعض نے اس کا اشتقاق بعض عربی مادوں سے بیان کیا ہے مثلاً یہ کہ یہ "م و س" کے فعل مجرد "ماس یموس" (مونڈنا) سے یا "م ی س" کے فعل "ماس یمیس" (اکڑ کر چلنا) سے "فُعْلیٰ" ہے۔ یا پھر "وسی" مادہ سے فعل "اَوْسیٰ یُوْسِی (باب اِفعال) رأسَهٗ" (اس نے اس کا سر مونڈا) سے اسم المفعول (مُفْعَلٌ) سمجھا۔ اشتقاق کے یہ تمام نظریات بالکل غلط ہیں۔ دراصل "ان مادوں سے (خصوصاً آخری مادہ سے) اسم الفاعل "مُوْسِی" (مُفْعِلٌ) عربی میں استرے (RAZOR) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور بعض اسے "موس" (ماس یموس۔ مونڈنا) سے "فُعْلیٰ" کے وزن پر مشتق گنتے اور اسی طرح (موسیً یا موسیٰ) ہی بولتے ہیں۔ بہرحال اس لفظ کا "موسیٰ علیہ السلام" کے نام سے کوئی لغوی یا اشتقاقی تعلق نہیں[2] ہے سوائے اس کے کہ اگر ضبط کے بغیر (بصورت "موسیٰ") لکھے ہوں تو دونوں میں ایک مشابہت لفظی ہے۔

● کلمہ "موسیٰ" جو ایک جلیل القدر پیغمبر کا نام ہے۔ دراصل ایک عبرانی (یا قبطی) لفظ ہے جو "مو" (پانی) اور "سا" (درخت) سے مرکب ہے یعنی وہ جو دریا کے پانی اور اس کے کنارے کی جھاڑیوں میں ملا[3]۔ موسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا یہ واقعہ قرآن کریم (القصص اور طٰہٰ) میں بھی بیان ہوا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام (مختلف واقعات کے ضمن میں) قرآن کریم کے اندر ۱۳۶ دفعہ وارد ہوا ہے

۲ : ۳۳ : ۱ (۳) [اَرْبَعِیْنَ] کا مادہ "ر ب ع" اور وزن "اَفْعِلِیْنَ" ہے جو لفظ "اَرْبَعٌ" (بمعنی چار)

---

[1] مثلاً اعراب القرآن (للنحاس) ج ۱ ص ۲۲۴ 'البیان (لابن الانباری) ج ۱ ص ۸۲ اور البیان (للعکبری) ج ۱ ص ۶۲ نیز متعدد تفاسیر۔

[2]، [3] دیکھئے البیان (للعکبری) ج ۱ ص ۶۲-۶۳۔ نیز القاموس (للفیروز آبادی)، مادہ "موس"

سے ماخوذ ہے۔ اس کی شکل بظاہر" اَرْبَعٌ "کی جمع مذکر سالم کی ملتی ہے یعنی بحالت رفع "اَرْبَعُونَ" اور بحالت نصب وجر" اربَعِينَ" ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے نحو کی اصطلاح میں "مُلحق بجمع المذکر السالم" (جمع مذکر سالم سے ملایا ہوا) کہتے ہیں۔

● اس کلمہ (اربعون یا اربعین) کے معنی ہیں "چالیس"۔ "اربع" (چار) اور "اربعین" (چالیس) اس مادہ (ربع) سے ماخوذ جامد اسماء ہیں یعنی ان کو اہل زبان نے ان معنوں کے لیے بنالیا ہے مگر یہ کسی قاعدہ اور اصول کے تحت بننے والے (مشتق) اسماء نہیں ہیں۔ لفظ "اربعین" (اسی طرح نصبی حالت میں) قرآن کریم میں کل چار جگہ آیا ہے۔

● اس مادہ (ر ب ع) سے فعل مجرد "ربَعَ یربَعُ" (باب فتح سے) مختلف مصادر کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے مثلاً "قیام پذیر ہونا، رسی کو چار بل دینا، انتظار کرنا" وغیرہ اور مزید فیہ کے ابواب تفعیل، تفعل، اِفعال اور افتعال وغیرہ سے بھی اس سے افعال مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتے ہیں تاہم قرآن کریم میں اس مادہ (ربع) سے کسی قسم کے فعل (مجرد یا مزید فیہ) کا کوئی صیغہ کہیں نہیں آیا۔ بلکہ صرف "عدد" والے معنی کے مختلف کلمات ۲۲ جگہ وارد ہوئے ہیں یعنی "رُبعٌ" (¼)، "رُباعَ" (چار چار)، "اَربَع" (چار)، "اربعۃ" (چار برائے مذکر)، "اَربَعِین" (چالیس) اور "رَابع" (چوتھا)۔ ان سب پر حسب موقع بات ہوگی۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

۲ : ۳۳ : ۱ (۴) [لَيْـلَةً] کا مادہ "ل ی ل" اور وزن "فَعْـلَةٌ" ہے (لفظ یہاں منصوب آیا ہے جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) اس مادہ سے فعل مجرد استعمال ہی نہیں ہوتا۔ مزید فیہ کے ابواب مفاعلہ اور افعال سے یہ بعض معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی ڈکشنری میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس مادہ سے کسی قسم کے فعل کا کوئی صیغہ کہیں بھی نہیں آیا۔

● اس مادہ سے اسم جامد "لَيْـلٌ" کے معنی ہیں: "سورج چھپنے کے بعد سے (پھر) سورج نکلنے تک کا وقت" جسے اردو میں "رات" کہتے ہیں۔ یہ اسم جنس ہے اور یہ لفظ "دن (نهارٌ) کے مقابلے پر استعمال ہوتا ہے۔ اگر کسی رات یا چند راتوں کا ذکر کرنا ہو یعنی "لَيْـلٌ" کی جنس سے "بعض" تو اس کے ساتھ تائے وحدت لگا کر لفظ "لَيْـلَةٌ" استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اس کا ترجمہ بھی "رات" ہی ہوگا۔ اس لیے کہ اردو میں کسی جنس کے لیے اور اس کے فرد واحد کے لیے الگ الگ لفظ (اسم) نہیں ہیں۔

● زیر مطالعہ عبارت [۲ : ۳۳ : ۱ (۳،۴)] میں "اربعین لیلۃً" عدد معدود (مرکب عددی) ہے اور اس کا ترجمہ "چالیس راتیں" ہوگا۔ اس پر مزید بحث آگے "الاعراب" میں آرہی ہے۔

۲ : ۳۳ : ۱ (۵) [ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ] "ثُمَّ" کا ترجمہ "پھر"، "اس کے بعد" ہے۔ اس کے معنی اور استعمال

کی مزید وضاحت کے لیے دیکھئے [۲ : ۲۱ : ۱ (۴)] "اِتَّخَذْتُمْ" کا مادہ "ا خ ذ" اور وزن "اِفْتَعَلْتُمْ" ہے۔ اس کی اصلی شکل "اِئْتَخَذْتُمْ" تھی۔ مگر اس مادہ سے بابِ افتعال کے فعل کو عرب لوگ ہمیشہ اس کے ہمزہ ساکنہ (فاء کلمہ) کو "ت" میں بدل کر دوسری "ت" (تائے افتعال) میں مدغم کر کے بولتے ہیں۔ اور اسی چیز کو کتبِ صرف میں "اخذ" کے بابِ افتعال کا قاعدہ ادغام کہہ کر بیان کیا جاتا ہے یعنی ریاضی کی زبان میں "اِئْتَخَذَ = اِيْتَخَذَ = اِتْتَخَذَ = اِتَّخَذَ"۔

● چونکہ یہ مہموز سے بابِ افتعال میں اس قسم کی تبدیلی کی ایک شاذ (بلکہ شاید اکلوتی) مثال ہے (خیال رہے مثال واوی میں بابِ افتعال میں "و" (فاء کلمہ) کا "ت" بن کر تائے افتعال میں ادغام ایک عام قاعدہ (کلیہ) ہے مگر مھموز میں ایسا نہیں ہوتا بلکہ عموماً اس صورت میں "ہمزہ" "ی" میں ہی بدلتا ہے)۔ اسی لیے بعض اہل لغت نے فعل "اتخذ" کا مادہ ہی (ت خ ذ) بتایا ہے۔ اس پر مزید بحث الکہف: ۷۸ میں "لَتَّخَذْتَ" کے ضمن میں آئے گی ان شاء اللہ تعالیٰ۔ تاہم اہل لغت کی اکثریت نے اس کا مادہ "اخذ" ہی قرار دیا ہے اور مہموز الفاء کے بابِ افتعال میں سے اس طرح ادغام والے افعال کی کچھ اور مثالیں بھی دی ہیں[1] مثلاً "اُزر" سے اتَّزَرَ (ازار باندھنا یا پہننا) اور "امن" سے اتَّمَنَ (امین بنانا)۔ اگرچہ ان دونوں افعال کا زیادہ استعمال "اِئْتَزَرَ" اور "اِئْتَمَنَ" کی صورت میں ہوتا ہے (جو ماقبل سے موصول نہ ہونے کی صورت میں "اِيْتَزَرَ" اور "اِيْتَمَنَ" ہوجاتے ہیں)

اس مادہ (اخذ) سے فعل مجرد کے باب معنی اور استعمال پر البقرہ: ۴۸ [۲ : ۳۱ : ۱ (۵)] میں بات ہو چکی ہے۔

● "اتخذتم" (زیر مطالعہ لفظ) علیٰ قول الاکثر اس مادہ (اخذ) سے باب افتعال کا فعل ماضی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اور اس باب (افتعال) سے اس کے فعل اِتَّخَذَ ... يَتَّخِذُ اِتِّخَاذاً (اصلی شکل اوپر بیان ہوئی ہے) کے معنی ہیں: "... کو ... بنا لینا"۔ اردو میں کبھی اس کا ترجمہ "پکڑنا" بھی کر لیا جاتا ہے مگر اس میں مفہوم "بنا لینا" کا ہی ہوتا ہے۔ عموماً اس فعل کے دو مفعول آتے ہیں جن کے مطابق حسبِ موقع اس فعل کا ترجمہ "حاصل کرنا، تیار کرنا، اختیار کرنا" کر لیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ اس کا مفعول ثانی محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے (جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے) جیسے اس زیر مطالعہ آیت میں ہے

---

[1] مثلاً راغب نے "اخذ" کے علاوہ "تخذ" ایک الگ مادہ کے طور پر لیا ہے اور القاموس المحیط (فیروز آبادی) میں "اخذ" کے علاوہ "تخذ" مادہ بھی لیا گیا ہے اور وہاں (مادہ تخذ کے تحت) کتاب کے متن اور حاشیے میں "اتخاذ" کے "اخذ" یا "تخذ" سے مشتق ہونے یا نہ ہونے کے دلائل مذکور ہیں۔

● قرآنِ کریم میں اس فعل (اتخذ یتخذ) کے مختلف صیغے ۲۰۱ سے زائد مقامات پر آئے ہیں اور اس کے مشتقات اور مصادر بھی پچاس کے قریب جگہوں پر آئے ہیں۔

زیرِ مطالعہ صیغہ (اتخذتم) کے مندرجہ بالا معنیٰ کو سامنے رکھتے ہوئے بیشتر مترجمین نے اس کا ترجمہ "تم نے پکڑا، بنا لیا، تجویز کر لیا، اختیار کیا، مقرر کر لیا" سے کیا ہے۔ جبکہ بعض نے محاورۃً "تم لے بیٹھے" سے تعبیر کیا ہے۔ بعض نے اس کا ترجمہ "تم نے پوجا شروع کر دی" کیا ہے جو تفسیری ترجمہ ہے اور بظاہر الفاظ سے بالکل ہٹ کر ہے۔ اگرچہ معنیٰ مراد یہاں یہی ہے۔

۲:۳۳:۱(۶) [اَلْعِجْلَ] کا مادہ "ع ج ل" اور وزن (لام تعریف نکال کر) "فِعْلٌ" ہے (عبارت میں یہ لفظ منصوب آیا ہے جس پر "الاعراب" میں بات ہوگی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد عجِل یعجَل عَجَلًا عَجَلَةً (باب سمع سے) لازم متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے بنیادی معنیٰ "جلدی کرنا، جلدی میں ہونا" ہیں۔ بطور متعدی استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں ..... سے آگے نکل جانا، پہل کر جانا۔ اس صورت میں اس کا مفعول بنفسہ آتا ہے مثلاً کہتے ہیں عجِل فلانًا (اَوِ) الامرَ (اس نے فلاں سے (یا) اس معاملے میں پہل کر دی) اور اسی سے ہے أَعَجِلتم امرَ ربّكم (الاعراف: ۱۴۹) (یعنی کیا تم نے اپنے رب کے حکم سے پہلے ہی جلد بازی کر ڈالی) ——— بطور فعل لازم یہ مختلف صلات کے ساتھ مختلف معنی دیتا ہے مثلاً (۱) عجِل ب ..... کو لے دوڑنا یعنی حاصل کرنے میں جلدی کرنا۔ اس استعمال کی مثال (طٰہٰ: ۱۱۴۔ اور القیامۃ ۱۶) میں ہے (۲) عجِل اِلی .... کے معنی ہیں .... کی طرف جلدی سے جانا، .... کی طرف جانے میں جلدی کرنا" اس کی مثال (طٰہٰ: ۸۴) میں ہے اور (۳) عجِل علی .. کا مطلب ہے .... کے بارے میں جلدی کرنا یعنی ان کے بارے میں جلدی فیصلہ چاہنا" قرآنِ کریم میں یہ استعمال (مریم: ۸۵) میں موجود ہے۔ قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد کے مختلف صیغے پانچ جگہ استعمال ہوتے ہیں۔ مزید فیہ کے باب تفعیل سے صیغہ ہائے فعل پانچ جگہ باب اِفعال اور تفعل سے صرف ایک ایک صیغہ اور باب استفعال سے کچھ صیغے ۱۹ جگہ آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مصادر و مشتقات اور بعض جامد اسماء کل ۱۵ مقامات پر وارد ہوتے ہیں۔

● زیرِ مطالعہ لفظ "العِجْل" (یا عِجْلٌ) اس مادہ سے ایک اسم جامد ہے اور اردو میں اس کے معنی ہیں "بچھڑا، گئو سالہ یا گوسالہ"۔ بعض کتب لغت میں "عِجْل" کا مطلب "گائے کا ایک سال یا ایک مہینے کی عمر تک کا نر بچہ" لکھا ہے[س]۔ بچھڑی کو "عِجْلَة" کہتے ہیں۔ عربی زبان میں (اونٹ گھوڑے وغیرہ کی

س البستان مادہ عجل۔ اور الإفصاح فی فقہ اللغۃ ج ۲۔ ص ۷۹۹۔ فقہ اللغۃ (للثعالبی) باب ۱۴ فصل ۴۔

طرح) گائے کے لیے عمر کے مختلف حصوں کے لیے دس کے قریب اسماء استعمال ہوتے ہیں جن میں سے دو "عَوَانٌ" اور "فَارِضٌ" بہت جلد ہمارے سامنے آئیں گے۔ لفظ "عِجْل" مختلف صورتوں (معرفہ نکرہ) میں اور مختلف اعرابی حالتوں میں قرآن کریم کے اندر کل ۹ مقامات پر وارد ہوا ہے۔

۲:۳۳:۱(۷) [مِنْ بَعْدِهٖ] یہ تین کلمات ہیں (۱) "مِنْ" جس کا یہاں کوئی الگ ترجمہ نہیں ہوگا بلکہ یہ بلحاظ ترکیب ہی نہیں بلحاظ معنی بھی "بَعْد" ہی کا حصہ ہے (۲) "بَعْد" جس پر ہم ابھی بات کریں گے کیونکہ یہ اپنے مادے سے پہلا لفظ ہے جو ہمارے سامنے آیا ہے (۳) "ہٖ" (ضمیر مجرور متصل بمعنی "اس کا/کے") ہے۔

● "بَعْدٌ" (جو عبارت میں مجرور اور خفیف آیا ہے اور جس کی وجہ "الاعراب" میں بیان ہوگی) کا مادہ "ب ع د" اور وزن (بحالتِ رفع) "فَعْلٌ" ہے۔

اس مادہ سے فعل مجرد (جس سے صرف ماضی کے دو صیغے قرآن کریم میں استعمال ہوئے ہیں) بعِد یبعَد بعدًا (سمع سے) اور بعُد یبعُد بُعدًا (کرم سے) آتا ہے اور دونوں کے بنیادی معنی: "دور ہونا" "دور ہو جانا" فاصلے پر ہونا" ہیں۔ یہ دونوں صورتوں میں فعل لازم ہے مگر "ب" کا صلہ لگا کر اسے متعدی (خصوصاً باب سمع سے) بنایا جا سکتا ہے مثلاً کہہ سکتے ہیں "بعِد به عن ....." (وہ اس کو .... سے دور لے گیا) تاہم یہ استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا۔ عربی زبان میں بطور محاورہ یہ فعل (دونوں ابواب سے) "ہلاک ہونا، تباہ ہونا" کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ فعل باب سمع سے "ہلاک ہو جانا" کے معنی میں اور باب کرم سے "دور فاصلے پر ہونا" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس مادہ سے فعل کا استعمال پہلی دفعہ "سورۃ التوبۃ" میں ہمارے سامنے آئے گا۔ قرآن کریم میں اس فعل مجرد سے فعل کے صرف دو صیغے (دو جگہ) اور باب مفاعلہ سے صرف ایک ہی صیغہ فعل آیا ہے۔ البتہ اس مادہ سے اسمائے جامدہ و مشتقہ اور مصادر وغیرہ (بعد کے علاوہ) ۳۳ جگہ آئے ہیں۔

● زیر مطالعہ کلمہ "بَعْدٌ" اس مادہ سے ماخوذ ایک اسم مبہم (غیر واضح) ہے جو ظرف کا کام دیتا ہے اور مضاف ہوئے بغیر یعنی مضاف الیہ کے بغیر اس کے معنی واضح نہیں ہوتے (اور اسی لیے اسے اسم مبہم کہتے ہیں)۔ مضاف ہو کر آئے تو بوجہ ظرفیت منصوب ہوتا ہے۔ جیسے "بَعْدَہٗ" میں ہے۔ یہ لفظ اردو میں مستعمل ہے بلکہ یہ اردو میں بھی ہمیشہ مضاف ہو کر استعمال ہوتا جیسے "اس کے بعد"۔ عربی زبان میں اس سے پہلے "مِنْ" آجائے تو لفظ "بعد" مجرور بھی ہو جاتا ہے جیسے "مِنْ بعدہٖ" میں ہے اس صورت میں مِنْ کا ترجمہ نہیں کیا جاتا (مثلاً "اس کے بعد سے") بلکہ اردو ترجمہ بعدہ اور من بعدہ (دونوں کا) "اس کے بعد" ہی ہوگا۔ بعض جگہ اردو میں اس کا ترجمہ "اس کے پیچھے" بھی کیا جا سکتا ہے۔

بعض دفعہ اس (بَعْد) کا مضاف الیہ محذوف کر دیا جاتا ہے اس وقت یہ (بعدُ) مبنی بر ضمہ ہو جاتا ہے یعنی ہر صورت میں اس کے آخر پر ضمہ (ـُـ) ہی رہتا ہے۔ چاہے پہلے "مِنْ" بھی کیوں نہ لگا ہو۔ (بلکہ اس صورت۔ حذفِ مضاف الیہ۔ میں اس سے پہلے عموماً "مِنْ" ضرور استعمال ہوتا ہے مثلاً کہیں گے "مِنْ بعدُ" اس کا اردو ترجمہ "بعد میں بھی" سے کرنا موزوں ہوتا ہے۔ دیکھئے مقابلے کے لیے "قَبْلُ" کا استعمال [۲:۳۱:۱(۴)] میں۔

خیال رہے کہ "بعد" بطور اسم معرب (بعدٌ، بعداً) بہت ہی کم استعمال ہوتا ہے بلکہ معرب ہو کر بھی یہ ظرف منصوب ہی رہتا ہے۔ مثلاً "بَعْداً" کا مطلب بھی "بعد میں یا بعد میں کبھی" کا ہی ہوگا۔ تاہم قرآن کریم میں یہ (منصوب معرب والا) استعمال کہیں نہیں آیا۔ البتہ بغیر حرف الجر اضافت (بعدَہ) مع الجر اضافت (من بعدِہ) اور مقطوع الاضافت صورت (مِن بعدُ) یعنی ان تینوں شکلوں میں یہ لفظ (بعد) قرآن کریم میں ۲۰ کے قریب مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

● آیت زیر مطالعہ میں "من بعدہ" کی ضمیر مجرور موسیٰ علیہ السلام کے لیے ہے۔ اور یہاں "من بعدہ" (اس کے بعد) کا مطلب "ان کی موت کے بعد" نہیں (کیونکہ بعض جگہ یہ ترکیب یہ معنی بھی دیتی ہے) بلکہ "اس کے (طور پر چلے جانے) کے بعد" مراد ہے اور یہ مفہوم سیاق قصہ سے معلوم ہوتا ہے اسی لیے اردو مترجمین نے یہاں "من بعدہ" کا ترجمہ اگرچہ "اس کے پیچھے" سے بھی کیا ہے تاہم بیشتر حضرات نے اس کا ترجمہ "ان کے گئے پیچھے" سے کیا ہے اور بعض نے ضمیر کی بجائے اسم ظاہر (موسیٰؑ) کے ساتھ ہی ترجمہ کیا ہے یعنی "موسیٰؑ کے بعد" یا موسیٰ کے جانے کے بعد" کی صورت میں۔ ظاہر ہے اسے تفسیری ترجمہ سمجھ کر ہی درست کہا جا سکتا ہے۔

۲:۳۳:۱(۸) [وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ] یہاں بھی "وَ" حالیہ بمعنی "درانحالیکہ یا صورتِ حال یہ تھی کہ" ہے اور "اَنتم" ضمیر مرفوع منفصل بمعنی "تم" ہے۔

"ظٰلِمُوْنَ" کا مادہ "ظ ل م" اور وزن "فاعِلُون" ہے۔ اس سے فعل مجرد "ظلَم یَظلِمُ ظُلماً" (عموماً ضرب سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ پر ظلم کرنا (لفظ "ظلم" اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ اردو میں مستعمل ہے) ۔ ۔ ۔ ۔ کی حق تلفی کرنا، حد سے بڑھنا، کسی چیز کو غلط جگہ پر رکھنا" وغیرہ۔ کبھی یہ فعل باب سمع سے بمعنی "رات کا تاریک ہونا" بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً کہتے ہیں: ظَلِمَ اللیلُ ظَلَماً۔ "رات خوب تاریک ہوگئی" تاہم یہ استعمال (بطور فعل) قرآن کریم میں نہیں آیا۔

● یہ فعل (ظلَم یظلِمُ) متعدی فعل ہے۔ اس کا مفعول بنفسہ آتا ہے۔ جیسے ۔ ۔ ۔ فقد ظلَمَ نفسَہ (البقرہ: ۲۳۱) (۔ ۔ ۔ پس اس نے اپنے آپ پر ہی ظلم کیا)۔ "حق تلفی" والے معنی کے لیے اس کے

دو مفعول (بنفسہٖ) بھی استعمال ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: ظَلَمَہٗ حَقَّہٗ (اس نے اس کا حق مارا)۔ یہ (دو مفعول والا استعمال قرآن کریم میں نہیں آیا بلکہ قرآن کریم میں تو اکثر اس کا ایک مفعول (جس پر ظلم کیا) بھی محذوف (غیر مذکور) ہوتا ہے جو سیاقِ عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اس فعل مجرد سے مختلف صیغہ ہائے فعل سو سے بھی زیادہ جگہ آئے ہیں۔ اور مصادر و مشتقات دو سو سے بھی زائد مقامات پر وارد ہوتے ہیں۔

● زیر مطالعہ لفظ (ظالمون) اس فعل مجرد (ظلَم یظلِم) سے اسم الفاعل "ظالِمٌ" کی جمع مذکر سالم ہے اور اردو میں اس کا لفظی ترجمہ "ظلم کرنے والے" ہی بنتا ہے۔ اکثر مترجمین نے اس عبارت (وانتم ظالمون) کا ترجمہ "اور تم ظالم تھے یا (سخت) ظالم تھے" ہی کیا ہے۔ بعض نے "تم بے انصاف ہوئے" ترجمہ کیا ہے اور بعض نے "یہ تمہاری بے انصافی تھی" (یعنی بچھڑا پوجنا) کو اختیار کیا ہے جو عبارت کے لفظ سے ہٹ کر ہے۔ اگرچہ مفہوم درست ہے۔ بعض حضرات نے اردو محاورے کا زور پیدا کرنے کے لیے ترجمہ "اور تم نے ظلم پر کمر باندھ رکھی تھی" کیا ہے جو خواہ مخواہ کا تکلف معلوم ہوتا ہے۔ بعض حضرات نے "تم ظلم کر رہے تھے" سے ترجمہ کیا ہے جو "ظالمون" کی بجائے "تظلمون" کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ ان تمام تراجم میں "تھے" یا "تھی" کے ساتھ ترجمہ آیت کے ابتدائی "وَاِذْ" کی وجہ سے ہے جو ظرف برائے زمانہ ماضی ہے۔ ورنہ جملہ اسمیہ ہونے کے اعتبار سے تو اس کا ترجمہ "تم ظالم ہو" ہی ہونا چاہیے۔

۲ : ۳۳ : ۱ (۹) [ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ] "ثُمَّ" (بمعنی پھر، اس کے بعد، پس) پر کئی دفعہ بات ہوئی ہے۔ "عفونا" پر ابھی بات ہوگی۔ اور "عنکم" میں "عن" اسی زیر مطالعہ فعل (عفونا) کا صلہ ہے اس پر بھی اس کے ساتھ بات ہوئی اور آخری ضمیر مجرور "کُمْ" یہاں بمعنی "تم سے" آئی ہے (بوجہ "عَن")

"عَفَوْنَا" کا مادہ "ع ف و" اور وزن "فَعَلْنَا" ہے۔ (یہ اپنی اصلی شکل میں۔ بغیر کسی قسم کی تعلیل کے ہے صرف واو لینہ کی وجہ سے تلفظ مختلف ہو جاتا ہے) یہ فعل ماضی معروف کا صیغہ جمع متکلم ہے۔

● اس ثلاثی مادہ سے فعل مجرد "عفا یعفو (در اصل عفَوَ یَعْفُوُ) عَفْوًا" (باب نصر سے) آتا ہے اور بطور لازم متعدی مختلف معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے مثلاً (۱) "مٹ جانا" کہتے ہیں "عفا الاَثرُ" (نشان مٹ گیا)۔ (۲) "زیادہ ہونا" کہتے ہیں "عفا الشیئُ" (چیز زیادہ ہو گئی) اور اسی کا مطلب "چیز پوشیدہ ہو گئی" بھی ہے (۳) "مٹا دینا" مثلاً "عفتِ الریحُ الاَثرَ" (ہوا نے نشان مٹا دیا) (۴) بڑھا دینا یا زیادہ کرنا مثلاً "عفا الشَعْرَ" (اس نے بال بڑھا لیے)۔ اور یہ تو اس فعل کے بغیر صلہ کے چند استعمالات ہیں۔ صلہ (خصوصاً "عَنْ" یا "لِ") کے ساتھ یہ زیادہ تر "درگزر کرنا، سزا نہ دینا، معاف کر دینا" کے معنی دیتا ہے (خیال رہے کہ خود لفظ "مُعَاف" اسی مادہ سے مشتق ہے اور اپنی اصل عربی

شکل "مُعَافیٰ" بمعنی "آزاد کیا ہوا" "چھوڑ دیا ہوا" سے ذرا سا بدل کر اردو میں مستعمل ہے) اور صلہ کے ساتھ (ان معنی کے لیے) استعمال کی کئی صورتیں ہیں مثلاً (۱) "عفا اللّٰہُ عَنْہُ" اللہ تعالیٰ نے اس سے درگزر کیا، معاف کر دیا" (۲) "عفا اللّٰہُ عَنْ ذَنْبِہٖ" اللہ نے اس کا گناہ معاف کر دیا یعنی اس کے گناہ کے بارے میں درگزر سے کام لیا اور (۳) "عفا اللّٰہ عَنْہُ ذَنْبَہٗ" اللہ نے اس کا گناہ اس کو معاف کر دیا اور (۴) "عفا اللّٰہُ لَہٗ ذنبہٗ" کا مطلب بھی یہی ہے (۵) "عفالَہٗ بمالِہٖ" کا مطلب ہے "اس نے اس کو اپنے مال میں سے زیادہ دیا۔ گویا یہاں "عفا" وہی زیادہ کرنا، بڑھا دینا والے معنی میں ہی استعمال ہوا ہے۔

● آپ کو عربی ڈکشنریوں میں اس فعل (عفا یعفو) کے کچھ اور معانی اور استعمالات بھی مل سکتے ہیں جو قرآن میں نہیں آئے۔ قرآن کریم میں یہ فعل زیادہ تر "درگزر کرنا" والے معنی کے لیے ہی آیا ہے، ۱۸ جگہ "عَن" کے صلہ کے ساتھ اور کم از کم آٹھ جگہ "عَنْ" کے حذف کے ساتھ مگر اسی مفہوم میں آیا ہے یعنی وہاں یہ مذکور نہیں کہ کس شخص یا کس جرم سے درگزر مراد ہے) صرف ایک جگہ یہ فعل "درگزر" والے معنی میں مگر "عن" کی بجائے "لِ" کے ساتھ آیا ہے۔ (البقرہ: ۲۷۸) اور صرف ایک ہی جگہ یہ (بطور صیغہ فعل) "زیادہ ہونا" اور "کثیر ہونا" کے معنی میں آیا ہے (الاعراف: ۹۵)۔ مندرجہ بالا بعض دیگر معانی (مٹنا مٹانا، پوشیدہ ہونا، بڑھا دینا وغیرہ) بھی قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوئے۔ تاہم غور سے دیکھا جائے تو "معافی اور درگزر" میں بھی اصل مفہوم "مٹا دینے" کا موجود ہے۔

● مجرد کے علاوہ عام عربی میں یہ مادہ (عفو) مزید فیہ کے متعدد ابواب (افعال، تفعیل، مفاعلہ، افتعال، استفعال وغیرہ) سے بھی مختلف معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ تاہم قرآن کریم میں اس سے صرف فعل مجرد کے ہی صیغہ ہائے فعل ۲۵ سے زیادہ مقامات پر آئے ہیں۔ اور اس کے بعض مشتقات (عفو، عَفُوٌّ، عافین وغیرہ) بھی سات جگہ وارد ہوئے ہیں۔ ان سب پر حسبِ موقع بات ہوگی۔ ان شاء اللہ۔

● زیرِ مطالعہ عبارت "ثم عَفَوْنا عنکم" کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "پھر ہم نے تم سے درگزر کیا"۔ اسی کو "معاف کیا تم کو" "تمہیں معافی دی، معاف کر دیا، معاف فرمایا" کی صورت بھی دی گئی ہے بعض نے "تمہارا قصور معاف کر دیا" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں اصل محذوف مفعول کو سامنے رکھا گیا ہے یعنی "عفونا عنکم ذنبکم" (دیکھئے اوپر صلات کے ساتھ اس فعل کے استعمال کی ۳ صورت)۔ قرآن کریم میں یہ فعل جہاں جہاں بھی "معاف کرنا" کے معنی میں آیا ہے وہاں "جس کو معافی ملی" وہ تو مذکور یا مقدر موجود ہے مگر "جس کام کی" معافی ملی (یعنی خطا، جرم، قصور وغیرہ) وہ سب جگہ محذوف ہے جو عبارت سے سمجھا جا سکتا ہے۔

[مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ] اس مرکب کے تینوں اجزاء (من + بعد + ذلك) پر الگ الگ پہلے کئی جگہ بات ہو چکی ہے اور "بعد" کا استعمال وغیرہ) تو ابھی اوپر [۲ : ۳۳ : ۱ (۷)] بیان ہوا ہے۔ اس طرح اس

حصۂ عبارت کا ترجمہ ہوا "اس کے بعد / پیچھے"۔ جسے بعض مترجمین نے "اس پر بھی" "اس کے بعد بھی" سے ترجمہ کیا ہے۔ اس میں "بھی" محاورے کے زور کے لیے ہے۔ بعض نے "اتنی بڑی بات ہوئے پیچھے" سے ترجمہ کیا ہے۔ اسے تفسیری ترجمہ بلکہ مفہوم ہی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اصل الفاظ سے تو بالکل ہٹ کر ہے۔

۲ : ۳۳ : ۱ (۱۰) [لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ] "لَعَلَّكُمْ" کا ترجمہ ہے "شاید کہ تم" یا "امید ہے کہ تم" بعض نے "امید" میں "مقصد" کا مفہوم پاکر اس کا ترجمہ "اس لیے کہ تم" "کہ کہیں تم" اور "تاکہ تم" سے کیا ہے "لَعَلَّ" کے مادہ، معنی اور اس مادہ سے کسی اور لفظ کے عدم استعمال پر البقرہ : ۲۱ [۲ : ۱۶ : ۱ (۴)] میں بات ہو چکی ہے۔

"تَشْكُرُوْنَ" کا مادہ "ش ک ر" اور وزن "تَفْعَلُوْنَ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد "شَكَرَ ... يَشْكُرُ شكرًا" (زیادہ تر باب نصر سے) آتا ہے اور اس کے معنی ہیں: "... کی نعمت یاد کرنا اور اس کا اظہار اور اعتراف کرنا" اور اسی کو ... کا شکر کرنا، ... کا احسان ماننا یا ... کا شکر گزار بننا" سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے (لفظ شکر اپنے اصل عربی مفہوم کے ساتھ اُردو میں متعارف ہے)۔ یہ فعل براہِ راست مفعول (بنفسہ) کے ساتھ بھی استعمال ہوتا ہے اور لام (لِ) کے صلہ کے ساتھ بھی۔ اور شاذ "ب" کے صلہ کے ساتھ بھی مثلاً کہتے ہیں "شکر اللہَ وشکر لِلّٰہ وشکر باللّٰہ" (اس نے اللہ کا شکر ادا کیا)۔ اگر مفعول اسم جلالت (اللہ) یا اس کے لیے کوئی ضمیر ہو تو لام کے صلہ والا استعمال زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں "باء (ب)" کے صلہ والا استعمال کہیں نہیں آیا پہلے دونوں استعمال (بنفسہ یا بصلہ لام) آتے ہیں۔ اگر مفعول "نعمة اللہ" ہو تو یہ زیادہ تر براہِ راست (بغیر صلہ کے) آتا ہے مثلاً کہیں گے "شکر نعمةَ اللہِ" (اس نے اللہ کی نعمت کا شکر ادا کیا) یہ استعمال بھی قرآن کریم میں وارد ہوا ہے۔

● عام عربی میں یہ فعل اس باب (نصر) سے بھی اور بابِ سمع سے (شکِر یشکَر) بعض ایسے معانی (مثلاً جانور کا تھوڑی خوراک پر بھی موٹا ہونا، درخت کی شاخیں نکلنا، بادل کا بارش سے بھر جانا وغیرہ) کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جو قرآن کریم میں استعمال نہیں ہوئے۔

● قرآن کریم میں یہ فعل صرف باب نصر سے اور بمعنی "شکر کرنا" ہی استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم میں صرف اس فعل مجرد سے مختلف صیغے ۴۶ جگہ آئے ہیں جن میں سے ۶ جگہ یہ فعل لام (ل) کے صلہ کے ساتھ اور صرف تین جگہ مفعول بنفسہ کے ساتھ آیا ہے۔ باقی تمام مقامات پر مفعول محذوف (غیر مذکور) ہے مگر وہ سیاقِ عبارت سے سمجھا جاتا ہے یعنی "لِلّٰہِ" یا "نعمة اللہِ"

● جب اس فعل کا فاعل "اللہ تعالیٰ" ہو تو اس کے معنی "اچھا اجر دینا" یا "قدر دانی کرنا" ہوتے ہیں مثلاً کہتے ہیں: "شکر اللہُ سَعْيَهٗ" (اللہ نے اس کی کوشش کا پھل دیا / کی قدر دانی کی) اس معنی میں

قرآن کریم کے اندر کوئی صیغۂ فعل تو نہیں آیا البتہ اس سے اسم الفاعل "شاکر" (اللہ تعالیٰ کے لیے) اور نیک اعمال کے لیے اسم صفت بصیغۂ اسم المفعول "مشکور" آتے ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں اس مادہ اور فعل مجرد سے مختلف مصادر اور اسماء مشتقہ ۲۹ جگہ آتے ہیں۔ جن پر حسبِ موقع بات ہو گی۔ اِن شاء اللہ تعالیٰ۔

● زیر مطالعہ لفظ "تشکرون" اس فعل مجرد (شکَر یشکُر) سے فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو فعل حال یا مستقبل کے ساتھ یعنی "تم شکر کرتے ہو یا شکر کرو گے" ہونا چاہیے مگر شروع میں "لعلکم" (شاید کہ تم، امید ہے کہ تم) لگنے سے اب اس کا بامحاورہ اردو ترجمہ "تم شکر کرو، شکر گزار بنو، احسان مانو" سے کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ فعل امر کا نہیں (جیسا کہ بظاہر لگتا ہے) بلکہ مضارع کا ہی ہے۔

۲: ۳۳: ۱(۱۱) [وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ] اس عبارت کے پانچوں اجزاء (وَ + اذ + آتینا + موسیٰ + الکتب) کا الگ الگ بیان یوں ہے۔۔۔۔ "وَاِذْ" "وَ" کے معانی پر [۲: ۷: ۱(۱)] میں اور "اِذْ" کے استعمال پر [۲: ۲۲: ۱(۱)] پر (پہلی دفعہ) بات ہوئی تھی۔ اس کے بعد بھی یہ کئی دفعہ گزر چکا ہے (دو دفعہ تو ۲: ۳۲: ۱ میں آیا ہے) اس کا ترجمہ "اور جب" ہے "اٰتَیْنَا" کا مادہ "ا ت ی" اور وزن "اَفْعَلْنَا" ہے جو دراصل "أَأْتَيْنَا" تھا۔ پھر ہمزۂ مفتوحہ کے بعد ہمزۂ ساکنہ الف کی آواز دیتا ہے اور اب اسے "ءَا" یا "ا" "آ" لکھا جاتا ہے ("آ" والی شکل عام عربی میں (بلکہ اردو فارسی میں بھی) مستعمل ہے مگر اسے کتابت مصحف کے ضبط میں استعمال نہیں کیا جاتا)

اس مادہ سے فعل مجرد (اتی یاتی) کی بحث البقرہ ۲۳: [۲: ۱۷: ۱(۴)] میں گزر چکی ہے۔ زیر مطالعہ لفظ (آتینا) اس مادہ (اتی) سے بابِ افعال کا فعل ماضی صیغہ جمع متکلم ہے۔ بابِ افعال سے اس فعل "آتی یُؤْتِی اِیْتَاءً" (بمعنی دینا یا ادا کرنا) کے معانی اور اس کے متعدی بدو مفعول ہونے کی البقرہ ۴۳: [۲: ۲۹: ۱(۵)] میں وضاحت کی جا چکی ہے اس کا ترجمہ "ہم نے دیا، عطا کیا، عنایت فرمایا" کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔

• "مُوْسَى" کی اصل اور اشتقاق پر ابھی اوپر [۲: ۳۳: ۱(۲)] میں بحث ہو چکی ہے۔ یہ لفظ جو ایک جلیل القدر پیغمبر کا نام ہے عربی فارسی اردو میں اسی املاء (موسی) کے ساتھ لکھا جاتا ہے جس کی "ی" الف مقصورہ کی صورت میں پڑھی جاتی ہے۔ یعنی "سا" کی طرح "الکتاب" (جس کا قرآنی رسم یہاں "الکتب" ہے) کا مادہ "ک ت ب" اور وزن، لامِ تعریف کے بغیر "فِعَالٌ" ہے (یہاں یہ لفظ منصوب آیا ہے۔ وجہ نصب آگے "الاعراب" میں بیان ہو گی)۔ اس مادہ سے فعل مجرد کے باب و معنی اور خود لفظ "الکتاب" کے معنی وغیرہ [۲: ۱: ۱(۲)] میں بیان ہو چکے ہیں۔ لفظ "کتاب" اردو میں بھی مستعمل ہے۔ اسی طرح

زیرمطالعہ عبارت (واذ آتینا موسی الکتب) کا ترجمہ بنا "اور جب دی ہم نے موسیٰ کو کتاب"۔
۲:۳۳:۱ (۱۲) [وَالْفُرْقَانَ] "وَ" اور "لام تعریف" نکال کر باقی لفظ "فُرْقَانٌ" ہے (جو عبارت میں منصوب ہے اس پر 'الاعراب' میں بات ہوگی) اس لفظ کا مادہ "ف ر ق" اور وزن "فُعْلَانٌ" ہے اس مادہ سے فعل مجرد (فَرَقَ یفرُقُ) کے باب اور معنی (جدا کرنا، الگ کرنا، ڈر جانا وغیرہ) پر ابھی اوپر [۲:۳۲:۱ (۱۰)] میں مفصل بات ہو چکی ہے۔

● زیرمطالعہ لفظ (فرقان) اس مادہ سے اسم صفت ہے۔ اور اس کے معنی ہیں: "جو حق و باطل میں فرق کر دے یعنی" واضح دلیل"۔ اور اسی لیے بعض دفعہ اس کا ترجمہ (یا معنی مراد) "معجزہ" بھی کر لیا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ قرآن کریم کا ایک (صفاتی) نام یا لقب بھی ہے۔ یہاں عبارت میں موسیٰ علیہ السلام کو "کتاب" کے ساتھ "فرقان" عطا ہونے کا ذکر ہے اس لیے مترجمین نے یہاں اس کا ترجمہ "معجزہ" کو باطل سے جدا کرنے والے احکام، فیصلہ کی چیز، قولِ فیصل، فیصلہ کرنے والی شریعت اور معجزے" سے کیا ہے۔ اور چونکہ یہ سب لفظ "الفرقان" کی توضیحات ہیں اس لیے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ کرنے کی بجائے "فرقان" ہی رہنے دیا ہے یہ لفظ (فرقان) مختلف صورتوں اور حالتوں میں قرآن کریم کے اندر سات دفعہ وارد ہوا ہے۔

[لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ] "لَعَلَّكُمْ" (شاید کہ تم) امید ہے کہ تم) پر ابھی اوپر [۲:۳۳:۱ (۱)] میں بات ہوئی نیز دیکھئے البقرہ: ۲۱ [۲:۱۶:۱ (۴)] "تَهْتَدُونَ" کا مادہ "ہ دی" اور وزن "تَفْتَعِلُونَ" ہے یہ دراصل "تَهْتَدِیُونَ" تھا۔ پھر واو الجمع سے ماقبل والا ناقص کا لام کلمہ (ی) ساقط کر کے عین کلمہ (د) کے کسرہ (ـِ) کو ضمہ (ـُ) میں بدل کر لکھا اور بولا جاتا ہے۔

اس مادہ (ھدی) سے فعل مجرد کے باب اور معنی وغیرہ پر الفاتحہ: ۶ [۱:۵:۱ (۱)] اور البقرہ: ۲ [۲:۱:۱ (۶)] میں بات ہو چکی ہے۔ زیرمطالعہ لفظ "تھتدون" اس مادہ سے باب افتعال کے فعل مضارع کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے۔ باب افتعال سے اس فعل (اھتدی یھتدی اھتداء) کے معنی (راستہ پالینا) اور مزید لغوی وضاحت کے لیے البقرہ: ۶ الیعنی [۲:۱۲:۱ (۷)] دیکھئے۔

اس صیغہ فعل (تھتدون) کا لفظی ترجمہ بنتا ہے "تم راستہ پالوگے" یا ہدایت پالوگے"۔ تاہم شروع کے "لعلکم" کی وجہ سے اس کا ترجمہ "تم راہ پاؤ، سیدھی راہ پاؤ، راہ یاب ہو جاؤ، راہ پر آؤ، راہ پر چلتے رہو" کی صورت میں کیا گیا ہے جب کہ بعض نے "ہدایت حاصل کرو" اور "ہدایت پاؤ" سے ہی ترجمہ کیا۔ لفظ ہدایت (جو عربی کے ہدایۃ کی ہی بگڑی ہوئی املا ہے) اردو فارسی میں اپنے اصل عربی معنی کے ساتھ مستعمل ہے

۲:۳۳:۲ الاِعراب

زیرِ مطالعہ تین آیات یوں تو سات جملوں پر مشتمل ہیں لیکن ان میں سے بعض جملے حال ہو کر دوسرے جملے کا (بلحاظِ مضمون) حصّے بنتے ہیں اس طرح بلحاظِ مضمون ہم اس قطعہ کو چار جملوں میں تقسیم کر کے اعرابی بحث کر سکتے ہیں:

(۱) واذ واعدنا موسٰی اربعین لیلةً

[وَ] عاطفہ بمعنی "اور" بھی ہو سکتی ہے اور مستانفہ (بمعنی "اور یہ بات بھی تو قابلِ ذکر ہے") بھی۔ [اِذْ] ظرف متعلق فعل محذوف (اُذکروا) ہے یا البقرہ: ۴۷ کی ابتدا میں آنے والے "اذکروا" پر معطوف سمجھ لیں تو پھر محذوف "اذکروا" کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور البقرہ: ۴۹ تا ۵۲ میں "واذ" چار دفعہ آ چکا ہے اور آگے البقرہ: ۸۴ تک کئی آیات کی ابتدا اسی (واِذْ) سے ہوگی۔ ہر جگہ اس کا اعراب یہی ہوگا۔ [واعَدْنا] جسے یہاں آسانی کے لیے برسم املائی لکھا گیا ہے، فعل ماضی معروف کا صیغہ متکلم ہے جس میں ضمیرِ تعظیم "نحن" بطور فاعل مستتر ہے۔ [موسیٰ] فعل "واعدنا" کا پہلا مفعول (لہٰذا) منصوب ہے مگر اسم مقصور ہونے کے باعث اس میں کوئی اعرابی علامتِ نصب ظاہر نہیں ہوتی۔ [اَرْبَعِیْنَ] یہ اسم عدد ہے جو "واعدنا" کا مفعول ثانی ہونے کے باعث منصوب ہے۔ علامت نصب آخری "نَ" سے پہلی "یاءِ ماقبل مکسور" (ـِ یْ) ہے جو جمع سالم مذکر کی علامتِ نصب و جر ہوتی ہے۔ اسماء عدد میں سے عقود (یعنی دہائیوں والے عدد) بلحاظِ اعراب (رفع نصب جر) جمع مذکر سالم کے ساتھ ملحق سمجھے جاتے ہیں یعنی اسی گروپ میں شمار کیے جاتے ہیں اور [لَیْلَةً] اسم عدد "اربعین" کا معدود (یعنی تمیز) ہے اس لیے منصوب ہے علامت نصب اس میں آخری "ۃ" کی دو زبریں (فتحتین) ہیں جسے نحو کی زبان میں تنوینِ نصب کہا جاتا ہے۔ ۱۱ سے ۹۹ تک کے اعداد کا معدود (تمیز) "واحد منصوب نکرہ" ہوتا ہے۔ خیال رہے یہاں "اربعین لیلة" مفعول بہ ہے "یعنی وعدہ دیا چالیس راتوں کا"۔ اگر اسے (اربعین لیلة کو) ظرف (مفعول فیہ) سمجھ کر منصوب قرار دیں تو مفہوم ہو جائے گا کہ "چالیس رات تک کی مدت میں یہ وعدہ لینے دینے کا کام ہوتا رہا" جو صاف ظاہر ہے غلط مفہوم ہے۔ اور "چالیس راتوں کے وعدہ" کا مطلب "چالیس راتیں دینا" نہیں کیونکہ رات کوئی لینے دینے کی شے تو نہیں ہے بلکہ اس سے مراد "چالیس راتیں (عبادت میں) مکمل کرنا" ہے۔ اس لیے نحوی یہاں لفظ "اتمام" مقدر مانتے ہیں یعنی "اِتمامَ اربعین لیلة"۔ تاہم اردو میں اس کا ترجمہ "چالیس راتوں کا" ہی کیا گیا ہے جس کا مفہوم "چالیس راتیں (عبادت کرنے) یا "چلہ مکمل کرنے" کا ہی ہے۔

(۲) ثم اتخذتم العجل من بعدہ وانتم ظالمون۔

[ثم] عاطفہ (بمعنی اس کے بعد) ہے۔ یہ حرف (ثمّ) تراخی اور ترتیب کا مفہوم دیتا ہے یعنی "ثُمَّ" کے بعد بیان کردہ کام "ثم" سے پہلے بیان کردہ کام کے بعد واقع ہوا۔ [اتخذتم] فعل ماضی معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے۔ یہ فعل "ثم" کے ذریعے سابقہ جملے کے فعل "واعدنا" پر عطف ہے یعنی اس کے بعد یہ کام ہوا کہ... [العجل] فعل "اتخذتم" کا مفعول اول ہے فعل ثانی محذوف کر دیا گیا ہے جو سیاقِ عبارت اور اس قصہ کی تفسیری تفصیلات سے سمجھا جاتا ہے یعنی "الٰھًا"۔ گویا عبارت ہے "اتخذتم العجل إلٰھًا" اور اسی لیے بعض مترجمین نے اس عبارت (اتخذتم العجل) کا ترجمہ ہی "تم نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی" کر لیا ہے۔ باقی تراجم [۲:۳۳:۱:۵] کے آخر پر بیان ہو چکے ہیں۔ [من بعدہ] "من" حرف الجر ہے "بعد" ظرف مضاف اور مجرور بالجر ہے اور "ہ" ضمیر مجرور اس کا مضاف الیہ ہے۔ اس مرکب جاری (من بعدہ) میں ضمیر مجرور (ہ) کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں جو اوپر "واعدنا موسیٰ" میں مذکور ہیں۔ اور "بعدہ" سے مراد "ان کے (طور پر چلے) جانے کے بعد" ہے کیونکہ صرف نحوی ترکیب ہی کو ملحوظ رکھا جائے تو اس کا مطلب "اس (کی وفات) کے بعد" بھی ہو سکتا ہے مگر یہ تفسیر (اور تفصیل واقعہ) کے خلاف ہے۔ قرآن فہمی کے لیے ترکیب نحوی یا اعرابی بحث کو سمجھنا ضروری تو ہے مگر بعض دفعہ خود ترکیب یا اعراب ہی کسی غلط فہمی کا باعث بن سکتے ہیں اور معنیٔ مراد متعین کرنے کے لیے کسی عقلی یا نقلی دلیل سے بھی کام لینا پڑتا ہے ["دلیل عقلی" اربعین لیلۃ" کو مفعول فیہ سمجھنے کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اور "نقلی دلیل" (روایت) یہاں "بعدہ" کے معنی متعین کرنے میں مددگار ثابت ہوئی ہے] اس کے بعد [وَ] حالیہ ہے (یعنی صورتِ حال یہ تھی کہ) [انتم] ضمیر مرفوع منفصل بطور مبتدا آئی ہے اور [ظالمون] اس (مبتدا) کی خبر (الذ) مرفوع ہے علامتِ رفع آخری "ن" سے پہلے والی واو ماقبل مضموم (ـُو) ہے "ان" تو اعرابی ہے جو بعض دفعہ، مثلاً مضاف ہو کر گر بھی جاتا ہے)۔ یہ جملہ اسمیہ (وانتم ظالمون) اپنے سے سابقہ جملے (اتخذتم العجل۔ پر مندرج بالا) کا حال ہو کر بلحاظ معنی اسی کا حصہ بنتا ہے۔

② ثم عفونا عنکم من بعد ذٰلک لعلکم تشکرون

[ثم] حرف عطف مثل سابق (ثم) ہے [عَفَوْنَا] فعل ماضی معروف صیغہ متکلم ہے جس میں ضمیر تعظیم "نحن" بطور فاعل مستتر ہے۔ [عنکم] میں "عَنْ" حرف الجر اور ضمیر مجرور "کم" مل کر فعل "عَفَوْنَا" سے متعلق ہیں۔ یا اس (فعل) کا مفعول بہ ہو کر (کیونکہ "عَنْ" یہاں صلۂ فعل ہے) محلاً منصوب ہے اور یہاں اصل مفعول (ذنبکم) محذوف ہے یعنی "تم کو معاف کیا تمہارا گناہ"۔ اسی لیے بعض مترجمین نے اس (عفونا عنکم) کا ترجمہ "تم کو معاف کیا جائے" کی بجائے "ہم نے تمہارا قصور معاف کر دیا"

ہی کیا ہے (باقی لغوی تراجم دیکھئے ۲ : ۳۳ : ۱ (۹)) میں [مِن بعدِ ذلکَ] "من" جار "بعد" ظرف مضاف اور "ذلک" مضاف الیہ ہے اور یہ مرکب اضافی (بعد ذلک) "مِنْ" کی وجہ سے مجرور (بالجر) ہے اور اسی کا اثر "بعد" کی "د" کی کسرہ (ِ) کی شکل میں ظاہر ہوا ہے۔ اور یہ مرکب جاری (من بعد ذلک) متعلق فعل "عَفَوْنا" ہے اور "ذلک" میں اشارہ "اتخاذ العجل" (بچھڑے کو لے بیٹھنا) کی طرف ہے۔ [لعلکم] میں "لَعَلّ" حرف مشبہ بالفعل اور "کم" ضمیر منصوب اس کا اسم ہے۔ [تشکرون] فعل مضارع معروف کا صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے۔ اس طرح یہ (تشکرون) فعل مع فاعل پورا جملہ فعلیہ ہے جو "لعلّ" کی خبر کا کام دے رہا ہے لہٰذا اسے محلاً مرفوع بھی کہہ سکتے ہیں اور یہ جملہ اسمیہ (لعلکم تشکرون) جسے بوجہ "لعلّ" جملۃ الرجاء بھی کہہ سکتے ہیں (کیونکہ "لعلّ" میں رجاء یعنی امید کا امکان یا مفہوم ہوتا ہے۔) یہ بلحاظ مضمون یہاں سابقہ جملے (ثم عفونا عنکم من بعد ذلک) کا حال قرار دے سکتے ہیں (اگرچہ یہاں کوئی واو حالیہ نہیں ہے) گویا مفہوم یہ بنتا ہے کہ "تم کو معافی دی اور اس حالت میں یہ امید کی جا سکتی تھی کہ تم شکرگزار بنو گے"۔ اس کے مختلف تراجم حصّہ "اللغۃ" میں دیکھئے۔ جہاں ترجموں کے تنوع کی وجہ بھی بیان کی گئی ہے۔

۴ واذ اٰتینا موسی الکتٰب والفرقان لعلکم تھتدون۔

[وَاِذْ] مثل سابق (یعنی عطف اور ظرف ہے۔ [اٰتینا] فعل ماضی معروف صیغہ متکلم مع ضمیر تعظیم "نحن" ہے۔ [موسیٰ] فعل "آتینا" کا پہلا مفعول بہ ہے جس میں اسم مقصور ہونے کے باعث علامت نصب ظاہر نہیں ہے [الکتاب] اس فعل کا دوسرا مفعول بہ ہے (فعل آتیٰ یؤتِی متعدی بدو مفعول آتا ہے) اور اس میں علامتِ نصب آخری "ب" کی فتحہ (َ) ہے [وَ] عاطفہ اور [الفرقان] اس (وَ) کے ذریعے "الکتاب" پر معطوف ہے لہٰذا اس کا اعراب بھی وہی (نصب کا) ہے جو "الکتاب" کا ہے۔ اس (الفرقانَ) میں علامت نصب "ن" کی فتحہ (َ) ہے الفرقان کے لغوی معنی تو اوپر حصّہ "اللغۃ" میں بیان ہو چکے ہیں تاہم یہاں اس سے کیا مراد ہے ؟ کیا "الکتاب" اور "الفرقان" ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ یا یہ دو الگ الگ چیزیں تھیں۔ اس قسم کی تفصیل آپ کو کتب تفسیر میں ملے گی۔ [لعلکم] یہ بھی حرف مشبہ بالفعل "لعلّ" اور اس کے اسم منصوب (ضمیر "کم") پر مشتمل ہے۔ اور [تھتدون] فعل مضارع معروف صیغہ جمع مذکر حاضر ہے جس میں ضمیر فاعلین "انتم" مستتر ہے اور یہ فعل مع فاعل (جملہ فعلیہ ہو کر) "لعلّ" کی خبر ہے جسے آپ محلاً مرفوع کہہ سکتے ہیں۔ اور یہاں بھی یہ جملہ اسمیہ "لعلکم تھتدون" (اوپر والے "لعلکم تشکرون" کی طرح) "جملۃ الرجاء" ہو کر سابقہ جملے (واذ آتینا موسی الکتاب والفرقان) کا حال ہو سکتا ہے یعنی "دریں حالت امید ہدایت

تھی" کے مفہوم میں۔

۲ : ۳۳ : ۳ الرسم

زیر مطالعہ آیات (۵۱-۵۳) میں بلحاظ رسم عثمانی صرف چار کلمات قابل ذکر ہیں یعنی: "وعدنا" ظلمون، الکتب اور ذلک: باقی کلمات کا رسم املائی اور عثمانی یکساں ہے۔

① "وعدنا" جس کا رسم املائی "واعدنا" ہے۔ قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (یہ لفظ قرآن میں تین جگہ آیا ہے) "بحذف الالف بعد الواو" لکھا جاتا ہے جس سے اس کی شکل "وَعَدْنَا" کی طرح ہو جاتی ہے پھر بذریعہ ضبط اس الف کو ظاہر کیا جاتا ہے کیونکہ یہ صرف کتابت میں گرا دیا جاتا ہے پڑھنے میں تو آتا ہے۔

② "ظلمون" جس کا املائی رسم "ظالمون" ہے۔ قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (اور یہ لفظ قرآن میں بصورت جمع مذکر سالم ۱۲۵ کے قریب مقامات پر آیا ہے) "حذف الالف بعد الظاء" کے ساتھ لکھا جاتا ہے۔ جمع مذکر سالم میں یہ حذف الف رسم عثمانی کا قاعدہ ہے۔

③ "الکتب" جس کا رسم معتاد "الکتاب" ہے، قرآن کریم میں یہاں اور ہر جگہ (معرفہ ہو یا نکرہ) "بحذف الالف بعد التاء" لکھا جاتا ہے۔ سوائے چار مقامات کے جہاں یہ باثبات الالف (کتاب) لکھا جاتا ہے تفصیل دیکھئے البقرہ ۲: [۲ : ۱ : ۳] میں

④ "ذلک" رسم املائی اور عثمانی دونوں میں بحذف الالف بعد الذال لکھا جاتا ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے [۲ : ۱ : ۳] میں۔

۲ : ۳۳ : ۴ الضبط

زیر مطالعہ آیات کے کلمات میں ضبط کے اختلاف یا تنوع کو حسب ذیل نمونوں سے سمجھا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر قابل ذکر فرق "نون کے اقلاب بمیم" کا ہے جو آپ من بعدہ اور "من بعد ذلک" کے ضبط میں دیکھیں گے:

وَاِذْ ، اِذْ ، إِذْ / وٰعَدْنَا ، وٰعَدْنَا ، وَعَدْنَا ، وَاٰعَدْنَا /
مُوْسٰی ، مُوسٰی ، مُوسٰی / اَرْبَعِیْنَ ، اَرْبَعِیْنَ ، أَرْبَعِيْنَ ،
أَرْبَعِينَ / لَيْلَةً ، لَيْلَةً / ثُمَّ ، ثُمَّ / اتَّخَذْتُمُ ، اتَّخَذْتُمُ ،
اتَّخَذْتُمُ / الْعِجْلَ ، الْعِجْلَ ، الْعِجْلَ / مِنْۢ بَعْدِهٖ ، مِنْ بَعْدِهٖ ،

spend all his energies and monetary sources for this cause.

As a matter of fact, if Muslims rejuvenate their relationship with the Quran on these lives, it will weld them into one Ummah with utmost mental and emotional unity and unique singularity of purpose and objective. All sorts of dissension, strife and antagonism among them will automatically vanish, and they will become united like a solid commented structure (in Quranic expression, *bunyan marsus*). And this will indeed be a concrete exemplification of the Holy Prophet's saying according to which God will give dignity and respect to those people who hold fast to the Quran and degrade and disgrace those who turn a deaf ear to it and do not discharge their obligations towards it. Allama Iqbal has expressed these very ideas in beautiful Persian verses thus:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتادۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

To sun up: there are the two practical steps through which a man personally becomes a true believer and the collectivity of believes takes the form of a strong ideological group. Now the question that crops up is: what methodology is to be pursued by this ideological group for its global struggle? This indeed is the subject matter of the next Quranic verse to be explained in the sequel. It is a happy coincidence that this methodology too consists of three points and we will dwell upon them at some length.

(To be continued)

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے اشاعت کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

commandments of Allah (vide verse 80 of Surah Nisa: He who obeys the Prophet, obeys God.) The second practical step is with regard to the Quran: *i'tisam bil-Quran*—holding fast and 'sticking' to the Quran firmly. And this obligation is to be discharged in a united manner. Division and dissension among Muslims is thoroughly disapproved by Allah (SWT).

Now the question is : What does 'holding fast together the cord of Allah' mean and imply in practical terms. In the booklet 'The Obligations Muslims Owe To the Quran' I have made an impassioned call to the Muslims 'to return to the Quran', to rededicate themselves to its study, and make it the sole guide for their lives. Instead of making purely academic attempts at describing the unique merits and magnificence of Quran, the most pertinent thing for us to do is that we should clearly understand our duties and responsibilities towards the Quran and then assess for ourselves whether or not we are conscientiously fulfilling these duties and responsibilities. Paying pompous tributes to the Quran will not be enough and it cannot be a substitute for actually discharging our obligations towards the Holy Book. Now what are these obligations? Or, in other words, what does the Quran demand from us? An objective study of the Book makes it amply clear that it makes five demands form every Muslim. Put in a simple language, these demands or obligations are as follows.

1. A Muslim is required to truly believe in the Quran.
2. He is required to read it properly.
3. He is required to understand it.
4. He is required to act upon its teachings both in his private and public life. He is required to struggle for the implementation of Sharia Law and social justice at the state level.
5. He is required to disseminate its teachings to others and operationalize Islam at the global level. He must

objective of Pakistan, divine punishment could whip us again any time and would whip us more severely. Indeed Pakistan has to prepare herself to face all the threats posed by the new world order. If, on the contrary, Pakistanis do not come out of their deep slumber and do not give up their materialistic pursuits, the anti-Islamic designs of the sole supreme world power will subjugate it to the point of virtual nonexistence. An ostrich-like attitude will not at all save us from perilous dangers and it is imperative that we at the earliest and in the right earnest read the writing on the wall.

If a true Muslim reflects on the conditions of Pakistan diligently and thoughtfully, he realize that the situation of Pakistanis totally resembles that of the Arabs before the advent of Islam depicted in the words of the Quran—'you stood on the brink of a pit of fire'. And the only way out of this pit of fire is the one delineated by these verses of surah Al-i-Imran. As the Quran is the eternal divine message for all humanity, its teachings too have abiding efficacy and applicability. No matter how degenerate our conditions and circumstances may be, the Quran offers a sure panacea for all our ills. In the Khatm-i-Quran prayer we most humbly pray to Almighty Allah that Quran may be made our leader, guide and beacon of light. But surely we cannot get it all merely for the asking. We have to struggle hard to achieve our solicited desires. Holding fast together to the cable of Allah (i.e., the Holy Quran) is the second practical point of the strategy laid down by the divine Book.

To summarize the action-agenda so far covered in these pages: the first practical step of the three-point Quranic strategy is with regard to *taqwa* and Islam. That is to say, a true Muslim should remain steadfast in his obedience and loyalty to God. He should avoid everything which is not pleasing to Him and live his entire life in total submission to His commandments. As a corollary, acting on the injunctions of the Holy Prophet (Peace be upon him) is also included in it, as the commandments of the Prophet are in fact the

(4) The banking system on which all our industry and trade, in fact our entire economy is based, is contaminated to this day the filth of interest. As a result the entire nation and the country is, in the words of the Quran at war with Allah and His Messenger (S.A.W.S).

(5) Accursed evils of gambling, speculation and lottery declared by Quran as "an abomination of Satan's handiwork"(رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ) are rampant.

(6) The system of feudalism and absentee landlordism, the worst and most abominable form of oppression and usurpation and which has basically not changed at all in spite of the so-called land reforms introduced twice.

(7) Mixed (non-segregated) social living that debased the West as far as modesty, chastity and purity are concerned. It destroyed the domestic peace and confounded the family structure. And this thing is such that it did not take roots in our society even during the British rule to the extent it is now in vogue and is increasing by leaps and bounds every day.

(8) The distinction between the 'tribal' and 'settled' areas in the N.W.F.P. is still continuing.

The current scenario of Pakistan calls for a total change in the entire body politic and soci-economic system of the homeland. Unity in the people of Pakistan and the establishment of Islamic social justice is the need of the day. This in fact was the real purpose of establishing Pakistan and only this can ensure her continued existence, stability and progress. It is on account of deviation from this very cause that the Muslim nation of Pakistan got divided into different regional, ethnic and linguistic nationalities. This breaking of our vow with Allah and disloyalty to His *deen* has led to tremendous plunder and bloodshed among the people of various regions. Divine punishment whipped us in 1971 and even now if we do not make headway towards the real

now turn the disarrayed and conflicting provinces of Pakistan into a strong unity provided the people of Pakistan earnestly act upon the three-point action strategy explained in these three verses.

It is an undeniable historical fact that the Indian sub-continent was partioned on the basis of two nation theory and Pakistan was established on the basis of Muslim nationhood and in the name of Islam. Muslims living in the widely separated areas of India were united by the bond of Islamic faith and demanded a separate homeland with the objective that Muslims of India, by removing all the taints of decadent and monarchical Islam, get an opportunity to re-establish the pristine Islamic system of political, economic and social justice which is the most important manifestation of the Holy Prophet's universal mercy and blessing. We regret to say, however, that in spite of the fact that forty seven years have passed since Pakistan was established, no real progress has as yet been made towards achieving the envisaged goal. The political and economic system inherited from the British Raj has throughout been kept intact; not only in the over all system, but in matters of social and communal values also we are strictly maintaining *status quo*. Both in practice and thought we exhibit the same old slavish mentality. The system to which we are sticking in the political governance of our homeland has the following important features:-

(1) Territorial Nationalism i.e. the concept of nationalism that was born of Western secularism and on whose absolute negation Pakistan movement was launched.

(2) Parliamentary Democracy, the initial training of which was imparted to us by our English rulers.

(3) The names and boundaries of the provinces demarcated by the British for their administrative expediency and which we consider not only permanent and everlasting but also sacrosanct.

and the pivot of Islam. Before the advent of Islam, there were animosities among the tribes which regularly broke out into fighting and devastation; every now and then there was much bloodshed. Things had reached a point that the entire Arabian nation seemed to be on the verge of destroying itself. It was due to the blessings of Islam alone that it was saved from being consumed by the fire to which this verse alludes. The people of yathrib (which later came to be known as Medina) had embraced Islam some three or four years before this verses were revealed. They had witnessed the blessing of Islam as it unified into one brotherhood the Aws and Khazraj, two tribes which had long been sworn enemies. Moreover, both tribes treated the migrants from Makkah in a spirit of sacrifice and love seldom seen even among members of the same family. The verse under consideration ends with the words: 'Thus Allah makes his signs clear to you that you may be guided to the right way'. That is to say, if people had eyes to see they could conclude for themselves whether their salvation lay in adhering fimly to the teachings of the Quran or in abandoning them and reverting to their former state. They could decide very easily whether their true well-sishers were God and His Messenger or those Jews, Polytheists and hypocrites who strove to plunge them back into their former despicable state.

Before we proceed further, it is quite appropriate to see if the historical evidence alluded to in this verse has any special hearing on the current political scenario of Pakistan. As Muslims we believe that the teachings of the Quran have eternal and ever-lasting validity and that, as a source of guidance, the Quranic principles have applicability for all places and for all times to come. Seen in this perspective, we can better appreciate the gravity of the conditions prevailing today in Pakistan and, at the same time, see a ray of hope offered to all believers in the Quranic verse under discussion. Just as Allah welded the warring Arab factions into a strong brotherhood fourteen centuries age, He can

The reason for the use of the word 'cord' (*habl*) is that the Quran both establishes a bond between man and God and joins all believers together in the religious fraternity. To take a firm hold on this cord means that the believers should attach utmost importance to their religion : this should always be the centre of their concerns; they should continually strive to establish it; and the common desire to serve it should make them cooperate with each other. As soon as Muslims turn their attention away from the fundamental teachings of their faith and lose sight of establishing its hegemony in life they begin to concern themselves with matters of secondary importance. And, just as they rent the communities of the former Prophets, enticing people away from their true objective in life, so schisms and dissensions are bound to plague their lives. If Muslims do this they are bound to suffer indignity and disgrace both in this world and the Next as happened with the followers of the previous Prophets. So a true Muslim is only one whose whole being is permeated with Islam; it is not a mere veneer or outward show. The simile of 'cord' or 'rope' is very significant indeed. It is that of people struggling in deep water, to whom a benevolent Providence stretches out a strong and unbreakable rope or cord of rescue. If all hold fast to it together, their mutual support adds to the chance of their safety.

After this, an historical evidence from the period in which the Quran was being revealed was presented and the believers were addressed thus :

> And remember with gratitude Gods favour on you, for you were enemies and he joined your hearts in love, so that by His grace you became brethren.

Yathrib, and indeed the whole of Arabia, was torn with civil and tribal feuds and dissensions before the Prophet of Islam set his sacred feet on its soil. After that, it, became the city of the Prophet, Medina, an unmatched brotherhood,

Clinging or holding fast to somebody for security is 'itesam'. So Allah Almighty enjoins upon all Muslim to hold fast to the Divine cord—the Holy Quran. The Arabic expression *'Jamee-an'* used in the verse can be interpreted in two ways, and I think both meanings are to be taken here. Firstly it may mean that all Muslims should jointly hold fast and cling to the Quran. Secondly it may also signify that the whole, and not a few parts, of the Quran is to be taken as guide for life. If only some fragmentary injunctions of the Divine writ are put into practice and others are simply ignored, this will resemble the attitude of the Israelites who were reproached very strongly by Allah in these words:

> Do you believe in a part of the Scripture and reject the other? What else, then, could be the retribution of those among you who do this than they should live in degradation in the present life, and that on the Day of Resurrection they should be sent to the severest chastisement. (Al-Baqarah 2 : 85)

Belief in the Quran remains imperfect until the code of life it lays down is accepted in its entirety. It is ironic to see that the majority of Westernized and secularized Muslims take a partial view of Islamic life and do not at all see the need to extend, strengthen and complete its Quranic foundations, with the result that the door to the highest stages of *taqwa* and *ihsan* are supposed to be open for a judge of court who may make decisions in violation of the Quran, for a lawyer who may argue on the basis of laws contrary to the Shariah, for the administrator who may manage the affairs of life in accordance with a system based on *kufr*, for the political leaders and his/her followers who may work for founding and building of life on the social and political principles of disbelievers—in short, for everyone, provided he fashions his outward style of life after a certain pattern and observes a few rituals and ceremonies of worship rites.

(May Allah bless us and enable us also to attest sincerely and with heart-felt certitude the fundamental metaphysical beliefs of Islam. Although we all verbally attest these credal beliefs, what is required is inner conviction and faith of the heart.) On this the Prophet said, "Rejoice at what you have got with yourselves because one end of the Quran is in Allah's hand and the other end is with you. So hold it fast. If you do that, you will never perish or go astray".

Despite these three authentic historical traditions of the Prophet, if someone maintains that *habl Allah* means something else than the Quran, his opinion cannot be taken seriously. Indeed he has no justification whatsoever for that. Allama Iqbal has expressed this very truth in a moving Persian couplet thus:

از یک آئینی مسلماں زندہ است پیکرِ ملّت ز قرآں زندہ است
ماہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

That is to say, the collective life and ummatic existence of the Muslims is due to the Quran that provides them with a legal framework and a code of life. The multitudes of Muslims have no significance; all significance rests with the Quran that functions like a throbbing heart in the socio political body of the Muslims. Iqbal, therefore, advises all of them to hold fast to the Quran as it is the cord of Allah.

The second imperative that is laid down by verse 103 is therefore, that all Muslims are commanded by Allah to hold fast to the Divine cord, the Quran. The Arbic verb *'itesam'* used in this verse is also very significant. The root of the verb—*'ismat'*—means security and protection; and the meaning of the verb *'itesam'* is to hold fast to something or some body for security and safety in the face of danger or threat. Its real sense comes out clearly when we see a child who in all his innocence clings to his mother and thinks that she can protect him form all sorts of dangers and odds.

writing commentary on Quran. But recourse to semantic and linguistic analysis or personal opinion should not in any was overrule the primary importance of the Prophet's sayings and explications. Following this paramount principle of Quranic exegesis, I shall mention here very briefly three ahadith of the Prophet (Peace be upon him) which explicate without an iota of doult the real import and meaning of *habl Allah*.

(i) A rather lengthy historical tradition on the Quran has been narrated by the forth Caliph Ali in which the Prophet is reported to have said about the Quran: It is this very Quran that is the cord of Allah (Tirmidhi and Darimi).

(ii) In another hadith, reported on the authority of Abdullab bin Masud, the Prophet (Peace be upon him) said: 'This Quran is the cord of Allah which He has stretched from the heavens to the earth.

(iii) The third hadith has been reported by Jubair bin Mutim and included in Tibrani Kabir. This hadith so graphically gives the details of an episode in the lifetime of the Prophet that the reader begins to feel for a few moments as if he himself is sitting in the company of the Prophet. Once the Holy Prophet came out of his closet and saw a few of the Companions studying and discussing the Quran in a corner of the mosque. The Prophet, very much pleased with this, approached them and asked them a strange question. This question we should also put to ourselves and see if we can sincerely give the same affirmative answer that was given by the Companions. The Prophet asked them, "Do you not attest to the truths that there is no god but Allah who alone should be worshipped, that he is one and without partner, that I am his messenger, and that this Quran has come from him?" All the companions firmly replied in the affirmative.

revelations called the 'occasions of revelation'. They were recorded by the Companions of the Prophet as a necessary aid for fixing the correct meaning of the Word of God. And linked with this is the belief with regard to Prophet Muahmmad (Peace be upon him) *Vis-a-vis* the Quran, for the clarified and elaborated the Quran, supplementing its broad general principles by giving them precise and detailed forms, and incorporating them into practical life, his own as well as those of his followers. Thus the Quran affirms this role of the Prophet in these words:

> And we sent down the Book to you for the express purpose that you should make clear to them those things in which they differ, and that it should be a guide and a mercy to those who believe. (Nahl 16 : 64)

In the light of these principles, for an understanding of the expression 'cord of Allah', we should turn to the traditions of the Holy Prophet (Peace be upon him). Despite the presence of authentic historical traditions of the Prophet about a practicular issue or point, it is wrong to resort to free play of reason or fancy. Indeed such interpretation of arbitrary opinion (tafsir bil-ray) has never found favour with orthodox Muslims. Many Urdu translators and exegesists of Quran have not bothered to study more than one available authentic (i.e., sound in terms of transmissional chain) historical statements of the Prophet himself which elucidate the expression. For one renowned scholar, the expression generally refers to the 'religion of God'. I see no reason why one should deal with it so cavalierly and ignore a genuine, trustworthy and *marfu* (in which the saying of the Prophet itself is reported) hadith. As a matter of principle, knowledge of Arabic language, grammar, lexicography, Arabic literature and familiarity with Arabic idiom of the times of the Prophet are all important as instruments for

divinely ordained mission. In other words, each Muslim must first himself become a sincere, whole-hearted and authentic believer in order to play his role in the discharge of ummatic obligations. The consolidation and invigoration of *iman* or *taqwa* in the individual person is the subject which has been dealt with most fully yet succinctly in the preceding verse of the Holy Quran. Now we move on to the second step.

We have seen that it is of utmost urgency for Muslims to join hands together for the realization of ummah's destiny as the standard-bearer of truth: the establishment of Divine order of social justice and equity on earth—bringing God's earth under God's rule. The most important question that arises here is : What is that bond or cementing material which would bind the Muslims into a strongly united group or collectivity? The Quranic verse under discussion provides answer to this very question:

> And hold fast, all together, the cord of Allah (that he stretched out for you), and be not divided among yourselves ....

The simile used here is that of people struggling in deep water, to whom a benevolent Providence stretches out a strong and unbreakable cord or rope of rescue. If all hold fast to it together, their mutual support adds to the chance of their safety. One may wonder here as to what '*habl-Allah*'—the cord of Allah—really means. Mention of a few methodological points with regard to the commentary on, and understanding of, the Quran are in order here. The first principle to be kept in mind in the interpretation and understanding of the Quran is that its one verse or portion is sometimes explained and elaborated by another verse or portion of the Quran. In case one does not find such explanation within the Quran, then the second recognized principle is to explore the backgrounds of the Quranic

HOLDING FAST TO THE CORD OF ALLAH

(Three-Point Action-Agenda For The Muslim Ummah-Part II)

Dr. Israr Ahmad
(Translated into English by: **Dr. Absar Ahmad)**

The next verse (verse 103) of *Surah* Al-i-Imran explains the second practical step that the Muslim Ummah is urged to undertake. All those who have accomplished to the maximum possible degree the requirement of the preceding verse and attained the driving force of *taqwa* (i.e, God-consciouses) in their lives—are called upon to unite and join together for the cause of Islam. Until and unless they join together and become like a solid steel-ribbed structure, they cannot achieve the supremacy and ascendancy of Islam at the global level. It is a well-established truth that an influential and wide-ranging mission, be it a moral or an immoral one, requires the joint efforts of a group of people.

The noblest and loftiest end—to make humanity surrender to one God—that Prophet Muhammad (Peace be upon him) achieved in his life time was also achieved with the selfless and dedicated cooperative efforts of his Companions. But the Prophet himself could achieve this within the boundaries of Arabian Peninsula and the task of disseminating Islam and making it dominant in the entire world was put on the shoulders of Muslim ummah. This gigantic task obviously calls for united and organizational struggle. Now just as a strong and solid wall requires strong blocks or bricks, the individual members of the Islamic *Jihad* movement should also be men of deep inner conviction and noblest character who strive together to bring all power and all powers under God. If the individual Muslim suffers from lack of commitment to the Islamic cause and is not a dedicated worker, the Islamic ummah cannot accomplish its

طلباء و طالبات کے لئے خوشخبری

مسلمانوں کی سائنسی ایجادات اور علمی کارناموں پر مشتمل
32 صفحات کا کتابچہ بعنوان

"مسلمانوں کی علمی خدمات"

تمام طلباء و طالبات مفت حاصل کر سکتے ہیں
اپنے تعلیمی ادارے کے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی اور ڈاک خرچ کے لئے ایک روپے
کا ڈاک ٹکٹ بھیج کر کتابچہ طلب کریں۔

○

پتہ: مکتبہ سراج منیر 287 ایف، رحمان پورہ، لاہور